درد آشوب

احمد فراز

جملہ حقوق کتاب کے ناشران کے پاس ہیں۔

یہ محض ایک الیکٹرانک کاپی ہے اور اس کا مقصد محض اردو ادب کی ترویج و ترقی ہے۔

السلام علیکم

پیارے دوستو پیغام ای بک سیریز کے سلسلہ کی پہلی کتاب پیش خدمت ہے.

اگرچہ انٹرنیٹ پر اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی کیلئے کئی ویب سائٹس اپنا حصہ ڈال رہی ہیں اور ہزاروں کی تعداد سے ای بکس اپ لوڈ کر چکی ہیں مگر یہ کتابیں زیادہ تر سکین امیجز کی صورت میں ہوتی ہیں اور عموماً سکیننگ سے وہ رزلٹ نہیں بن پاتا جو اردو ادب کے شایان شان ہو۔

لہذا پیغام ڈاٹ کام نے اس کمی کو دور کرنے کیلئے ایک ادنیٰ سی کوشش کی ہے اب یہ کوشش کس حد تک کامیاب رہی یہ آپ دوستوں کی فیڈبیک ہمیں بتائے گی۔

کوئی بھی انسان یا انسانی تخلیق کبھی بھی مکمل نہیں ہوتی، سو اس کتاب میں بھی ہزاروں خامیاں موجود ہوں گی، ہم امید کرتے ہیں کہ آپ نشاندہی فرما کر کتاب کو زیادہ خوبصورت بنانے میں ہماری رہنمائی فرمائیں گے۔

پیغام انتظامیہ تہہ دِل سے ان تمام دوستوں کی شکر گزار ہے جنہوں نے کتاب کی تیاری کے دوران بھرپور حصہ لیا اور جو بے لوث محبتوں سے اردو زبان و ادب کی ترقی کیلئے کوشاں ہے۔

ترتیب

1	فنکاروں کے نام	9
2	رنجش ہی سہی دل ہی دکھانے کے لئے آ	12
3	قربتوں میں بھی جدائی کے زمانے مانگے	13
4	معبود	14
5	جز ترے کوئی بھی دن رات نہ جانے میرے	16
6	نہ حریفِ زمانہ نہ شریکِ غم شبِ انتظار کوئی تو ہو	18
7	شاخِ نہالِ غم	19
8	خود کلامی	21
9	دل تو وہ برگِ خزاں ہے کہ ہوا لے جائے	23
10	نہ انتظار کی لذت نہ آرزو کی تھکن	24
11	ہم تو یوں خوش تھے کہ اک تار گریبان میں ہے	26
12	خاموش ہو کیوں دادِ جفا کیوں نہیں دیتے	27
13	اظہار	28
14	خودکشی	29

سن بھی اے نغمہ سنج کنجِ چمن اب سماعت کا اعتبار کسے

16	دل بہلتا ہے کہاں انجمن و مہتاب سے بھی	31
17	وفا کے باب میں الزامِ عاشقی نہ لیا	32
18	شکست	33
19	زیرِ لب	34
20	ایسے چپ ہیں کہ یہ منزل بھی کڑی ہو جیسے	36
21	کیا ایسے کم سخن سے کوئی گفتگو کرے	37
22	ہر ایک بات نہ کیوں زہر ہماری لگے	38
23	ہمدرد	39
24	خواب	41
25	سو دوریوں پہ بھی مرے دل سے جدا نہ تھی	42
26	جو بھی دکھ یاد نہ تھا یاد آیا	44
27	سوال	46
28	غریبِ شہر کے نام	48
29	زخم کو پھول تو سر سر کو صبا کہتے ہیں	50
30	گل ہو چراغِ مے تو سزاوارِ سنگ ہیں	51
31	وہی جنوں ہے وہی کوچۂ ملامت ہے	52

پیغام seekho aur sikhao

32	پیغام بر	53
33	روز کی مسافت سے چور ہو گئے دریا	58
34	تُو کہ انجان ہے اس شہر کے آداب سمجھ	59
35	خدائے برتر	60
36	قرب جز داغِ جدائی نہیں دیتا کچھ بھی	62
37	دوست بن کر بھی نہیں ساتھ نبھانے والا	63
38	یہ عالمِ شوق کا دیکھا نہ جائے	65
39	خود غرض	67
40	وابستگی	68
41	دل بھی بجھا ہو شام کی پرچھائیاں بھی ہوں	70
42	جب تری یاد کے جگنو چمکے	71
43	ممدوح	72
44	پیام آئے ہیں اس یارِ بے وفا کے مجھے	75
45	بے نیازِ غمِ پیمانِ وفا ہو جانا	76
46	اے نگارِ گل	77
47	گلشدہ شمعوں کا ماتم نہ کرو	79

پیغام seekho aur sikhao

48	دل میں اب طاقت کہاں خُوننابہ افشانی کرے	81
49	بے سروسامان تھے لیکن اتنا اندازہ نہ تھا	82
50	تپتے صحراؤں پہ گر جا سرِ دریا برسا	83
51	افعی کی طرح ڈسنے لگی موجِ نفس بھی	84
52	اے مرے بے درو شہر	85
53	گھر میں کتنا سناٹا ہے باہر کتنا شور	87
54	پھر اسی راہگزر پر شاید	88
55	اب وہ جھونکے کہاں صبا جیسے	89
56	تریاق	90
57	مستقل محرومیوں پر بھی تو دل مانا نہیں	91
58	تو پاس بھی ہو تو دل بیقرار اپنا ہے	92
59	جس سے یہ طبیعت بڑی مشکل سے لگی تھی	93
60	کسی کے تذکرے بستی میں کو بکو جو ہوئے	94
61	مجھ سے پہلے	95
62	کروں نہ یاد مگر کس طرح بھلاؤں اسے	97
63	اب اور کیا کسے سے مراسم بڑھائیں ہم	98

پیغام seekho aur sikhao

64	اتری تھی شہرِ گل میں کوئی آتشیں کِرن	99
65	کوئی بھٹکتا بادل	100
66	کیسی طلب اور کیا اندازے مشکل ہے تقدیر بنے	101
67	اپنی محبت کے افسانے کب تک راز بناؤ گے	102
68	زندگی اے زندگی	103
69	چند لمحوں کے لیے تُو نے مسیحائی کی	105
70	زعم ایسا کیا کہ لطفِ دوست ٹھہرانا پڑے	106
71	اب نہ فرصت ہے نہ احساس ہے غم سے اپنے	107
72	یہ تو جب ممکن ہے	108
73	تم بھی خفا ہو لوگ بھی برہم ہیں دوستو	109
74	تو کہاں تھا زندگی کے روز و شب آنکھوں میں تھے لمحے وفورِ شوق کے ایسے نہ آئے تھے	110
76	شہدائے آزادی کے نام	112
77	پیمبرِ مشرق	114
78	اسی خیال میں تاروں کو رات بھر دیکھوں	117
79	جنبشِ مژگاں کہ ہر دم دلکشائے زخم ہے	118

پیغام seekho aur sikhao

80	المیہ	120
81	ملکیت	121
82	منظر کب سے ہے تحیر ہے تری تقدیر کا	123
83	اہلِ غم جاتے ہیں نا امید ترے شہر سے	124
84	تمثیل	125
85	آنکھوں میں چبھ رہے ہیں در و بام کے چراغ	126
86	نظر کی دھوپ میں سائے گھلے ہیں شب کی طرح	127
87	ہم کیا کہ اسی سوچ میں بادِ چمنی تھی	128
88	نیند	129
89	خوشبو کا سفر	130
90	اب کے برس	131
91	تجھ سے مل کر بھی کچھ خفا ہیں ہم	133
92	تجھے اداس کیا خد بھی سوگوار ہوے	134
93	اَن دیکھے دریاؤں کے سفیر	135
94	اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں	137
95	اچھا تھا زخم نہ بھرتے کوئی دن اور	138

پیغام seekho aur sikhao

96	ترس رہا ہوں مگر تو نظر نہ آ مجھ کو	139
97	کسی طرح تو بیاں حرفِ آرزو کرتے	140
98	میں اور تُو	142
99	کون آتا ہے مگر آس لگائے رکھنا	144
100	افریشیائی ادیبوں کے نام	145
101	میں کہ پر شور سمندر تھے مرے پاؤں میں	148

پیغام seekho aur sikhao

فنکاروں کے نام

تم نے دھرتی کے ماتھے پہ افشاں چنی
خود اندھیری فضاؤں میں پلتے رہے
تم نے دنیا کے خوابوں کی جنت بُنی
خود فلاکت کے دوزخ میں جلتے رہے
تم نے انسان کے دل کی دھڑکن سنی
اور خود عمر بھر خون اگلتے رہے

پیغام
seekho aur sikhao

جنگ کی آگ دنیا میں جب بھی جلی
امن کی لوریاں تم سناتے رہے
جب بھی تخریب کی تُند آندھی چلی
روشنی کے نشاں تم دکھاتے رہے
تم سے انساں کی تہذیب پھولی پھلی
تم مگر ظلم کے تیر کھاتے رہے

تم نے شہکار خونِ جگر سے سجائے
اور اس کے عوض ہاتھ کٹوا دیئے
تم نے دنیا کو امرت کے چشمے دکھائے
اور خود زہرِ قاتل کے پیالے پیے
تم نے ہر اک کے دکھ اپنے دل سے لگائے
تم جیے تو زمانے کی خاطر جیے

تم پیمبر نہ تھے عرش کے مدعی
تم نے دنیا سے دنیا کی باتیں کیں
تم نے ذروں کو تاروں کی تنویر دی
تم سے گو اپنی آنکھیں بھی چھینی گئیں
تم نے دکھتے دلوں کی مسیحائی کی
اور زمانے سے تم کو صلیبیں ملیں

seekho aur sikhao

کاخ و دربار سے کوچہِ دار تک
کل جو تھے آج بھی ہیں وہی سلسلے
جیتے جی تو نہ بن پائی چمن کی مہک
موت کے بعد پھولوں کے مرقد ملے
اے مسیحاؤ، یہ خودکشی کب تلک
ہیں زمیں سے فلک تک بڑے فاصلے

پیغام
seekho aur sikhao

رنجش ہی سہی دل دکھانے کے لیے آ
آ پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لیے آ

کچھ تو مرے پندارِ محبت کا بھرم رکھ
تُو بھی تو کبھی مجھ کو منانے کے لیے آ

پہلے سے مراسم نہ سہی پھر بھی کبھی تو
رسم وراہِ دنیا ہی نبھانے کے لیے آ

کس کس کو بتائیں گے جدائی کا سبب ہم
تُو مجھ سے خفا ہے تو زمانے کے لیے آ

اک عمر سے ہوں لذتِ گریہ سے بھی محروم
اے راحتِ جاں مجھ کو رلانے کے لیے آ

اب تک دلِ خوش فہم کو ہیں تجھ سے امیدیں
یہ آخری شمعیں بھی بجھانے کے لیے آ

قربتوں میں بھی جدائی کے زمانے مانگے
دل وہ بے مہر کہ رونے کے بہانے مانگے

ہم نہ ہوتے تو کسی اور کے چرچے ہوتے
خلقتِ شہر تو کہنے کو فسانے مانگے

یہی دل تھا کہ ترستا تھا مراسم کے لیئے
اب یہی ترکِ تعلق کے بہانے مانگے

اپنا یہ حال کہ جی ہار چکے لٹ بھی چکے
اور محبت وہی انداز پرانے مانگے

زندگی ہم ترے داغوں سے رہے شرمندہ
اور تو ہے کہ سدا آئنہ خانے مانگے

دل کسی حال پہ قانع ہی نہیں جانِ فرازؔ
مل گئے تم بھی تو کیا اور نہ جانے مانگے

معبود

بہت حسین ہی تیری عقیدتوں کے گلاب
حسین تر ہے مگر ہر گلِ خیال ترا
ہم ایک درد کے رشتے میں منسلک دونوں
تجھے عزیز مرا فن، مجھے جمال ترا

پیغام
seekho aur sikhao

مگر تجھے نہیں معلوم قربتوں کے الم
ترے نگاہ مجھے فاصلوں سے چاہتی ہے
تجھے خبر نہیں شاید کہ خلوتوں میں مری
لہو اگلتی ہوئی زندگی کراہتی ہے

تجھے خبر نہیں شاید کہ ہم وہاں ہیں جہاں
یہ فن نہیں اذیت ہے زندگی بھر کی
یہاں گلوئے جنوں پر کمند پڑتی ہے
یہاں قلم کی زباں پر ہے نوک خنجر کی

ہم اس قبیلہء وحشی کہ دیوتاہیں کہ جو
پجاریوں کی عقیدت پہ پھول جاتے ہیں
اور ایک رات کے معبود صبح ہوتے ہی
وفا پرست صلیبوں پہ جھول جاتے ہیں

پیغام seekho aur sikhao

جُز ترے کوئی بھی دن رات سنہ جانے میرے
تُو کہاں ہے مگر دوست پرانے میرے

تُو بھی خوشبو ہے مگر میرا تجسس بے کار
برگِ آوارہ کی مانند ٹھکانے میرے

شمع کی لَو تھی کہ وہ تُوھتا مگر ہجر کی رات
دیر تک روتا رہا کوئی سرہانے میرے

خلق کی بے خبری ہے کہ مری رسوائی
لوگ مجھ کو ہی سناتے ہیں فسانے میرے

لُٹ کے بھی خوش ہوں کہ اشکوں سے بھرا ہے دامن
دیکھ غارت گرِ دل یہ بھی خزانے میرے

آج اک اور برس بیت گیا اس کے بغیر
جس کے ہوتے ہوئے ہوتے تھے زمانے میرے

----ق----

کاش تُو بھی مری آواز کہیں سُنتا ہو
پھر پکارا ہے تجھے دل کی صدا نے میرے

کاش تو بھی کبھی آجائے مسیحائی کو
لوگ آتے ہیں بہت دل کو دُکھانے میرے

کاش اوروں کی طرح میں بھی کبھی کہہ سکتا
بات سُن لی ہے مری، آج خدا نے میرے

تُو ہے کس حال میں اے زود فراموش مرے
مجھ کو تو چھین لیا عہدِ وفا نے میرے

چارہ گریوں تو بہت ہیں مگر اے جانِ فرازؔ
جز ترے اور کوئی زخم نہ جانے میرے

نہ حریفِ جاں نہ شریکِ غم شبِ انتظار کوئی تو ہو
کسے بزمِ شوق میں لائیں ہم دلِ بے قرار کوئی تو ہو

کسے زندگی ہے عزیز اب کسے آرزوئے شبِ طرب
مگر اے نگارِ وفا طلب ترا اعتبار کوئی تو ہو

کہیں تارِ دامنِ گل ملے تو یہ مان لیں کہ چمن کھلے
کہ نشانِ فصلِ بہار کا سرِ شاخسار کوئی تو ہو

یہ اداس اداس سے بام و در، یہ اجاڑ اجاڑ سی رہگزر
چلو ہم نہیں نہ سہی مگر سرِ کوئے یار کوئی تو ہو

یہ سکونِ جاں کی گھڑی ڈھلے تو چراغِ دل ہی نہ بجھ چلے
وہ بلا سے ہو غمِ عشق یا غمِ روزگار کوئی تو ہو

سرِ مقتلِ شبِ آرزو، رہے کچھ تو عشق کی آبرو
جو نہیں عدو تو فراز تو کہ نصیب دار کوئی تو ہو

شاخِ نہالِ غم

میں ایک برگِ خزاں کی مانند
کب سے شاخِ نہالِ غم پر
لرز رہا ہوں
مجھے ابھی تک ہے یاد وہ جاں فگار ساعت
کہ جب بہاروں کی آخری شام
مجھ سے کچھ یوں لپٹ کے روئی
کہ جیسے اب عمر بھر نہ دیکھے گا
ہم میں ایک دوسرے کو کوئی
وہ رات کتنی کڑی تھی
جب آندھیوں کے شب خوں سے
بوئے گل بھی لہولہو تھی
سحر ہوئی جب تو پیڑ یوں خشک و زرد رُو تھے
کہ جیسے مقتل میں میرے بچھڑے ہوئے رفیقوں کی
زخم خوردہ برہنہ لاشیں

پیغام seekho aur sikhao

گڑی ہوئی ہیں

میں جانتا تھا

کہ جب یہ بوجھل اشجار

جن کی کہنہ جڑیں زمیں کی عمیق گہرائیں میں برسوں سے جاگزیں تھیں

ہجومِ صرصر میں چند لمحے یہ ایستادہ نہ رہ سکے تو

میں ایک برگِ خزاں بھی

شاخِ نہالِ غم پر رہ سکوں گا

وہ ایک پل تھا کہ ایک رُت تھی

مگر مرے واسطے بہت تھی

مجھے خبر ہے کہ کل بہاروں کی اوّلیں صبح

پھر سے بے برگ و بار شاخوں کو

زندگی کی نئی قبائیں عطا کرے گی

مگر مرا دل دھڑک رہا ہے

مجھے، جسے آندھیوں کی یورش

خزاں کے طوفاں نہ چھُو سکے تھے

کہیں نسیمِ بہار۔۔۔ شاخِ نہالِ غم سے

جُدا نہ کر دے

خود کلامی

دیکھے ہی نہیں وہ لب و رخسار و گیسو
بس ایک کھنکتی ہوئی آواز کا جادو
حیران پریشاں لیے پھرتا ہے بہر سُو

پیغام
seekho aur sikhao

پابندِ تصور نہیں وہ جلوہ بے تاب
ہو دُور تو جگنو ہے قریب آئے تو خوشبو
لہرائے تو شعلہ ہے چھنک جائے تو گھنگرو

باندھے ہیں نگاہوں نے صداؤں کے بھی منظر
وہ قہقہے جیسے بھری برسات میں کُو کُو
جیسے کوئی قمری سرِ شمشادِ لبِ جُو

اے دل تری باتوں میں کہاں تک کوئی جائے
جذبات کی دنیا میں کہاں سوچ کے پہلو
کب آئے ہیں فتراک میں وحشت زدہ آہُو

مانا کہ وہ لب ہوں گے شفق رنگ و شرر خُو
شاید کہ وہ عارض ہوں گُلِ تر سے بھی خوشرو
دل کش ہی سہی حلقۂ زلف و خمِ ابرو

پیغام
seekho aur sikhao

یہ کس کو خبر کس کا مقدر ہے یہ سب کچھ
خوابوں کی گھٹا ڈُور برس جائے گی اور تُو
لَوٹ آئے گا لے کر فقط آہیں فقط آنسو

دل تو وہ برگِ خزاں ہے کہ ہوا لے جائے
غم وہ آندھی ہے کہ صحرا بھی اُڑا لے جائے

کون لایا تری محفل میں ہمیں ہوش نہیں
کوئی آئے تری محفل سے اُٹھا لے جائے

اور سے اور ہوئے جاتے ہیں معیارِ وفا
اب متاعِ دل و جاں بھی کوئی کیا لے جائے

جانے کب ابھرے تری یاد کا ڈوبا ہُوا چاند
جانے کب دھیان کوئی ہم کو اُڑا لے جائے

یہی آوارگیِ دل ہے تو منزل معلوم
جو بھی آئے تری باتوں میں لگا لے جائے

دشتِ غربت میں تمہیں کون پکارے گا فرازؔ
چل پڑو خود ہی جدھر دل کی صدا لے جائے

نہ انتظار کی لذت نہ آرزو کی تھکن
بجھی ہیں درد کی شمعیں کہ سو گیا ہے بدن

سُلگ رہی ہیں نہ جانے کس آنچ سے آنکھیں
نہ آنسوؤں کی طلب ہے نہ رتجگوں کی جلن

دلِ فریب زدہ! دعوتِ نظر پہ نہ جا
یہ آج کے قد و گیسو ہیں کل کہ دار و رسن

پیغام seekho aur sikhao

غریبِ شہر کسی سایۂ شجر میں نہ بیٹھ
کہ اپنی چھاؤں میں خود جل رہے ہیں سرو و سمن

بہارِ قرب سے پہلے اجاڑ دیتی ہیں
جدائیں کی ہوائیں محبتوں کے چمن

وہ ایک رات گزر بھی گئی مگر اب تک
وصالِ یار کی لذت سے ٹوٹتا ہے بدن

پھر آج شب ترے قدموں کی چاپ کے ہمراہ
سنائی دی ہے دلِ نامراد کی دھڑکن

یہ ظلم دیکھ کہ تُو جانِ شاعری ہے مگر
مری غزل میں ترا نام بھی ہے جرمِ سخن

پیغام seekho aur sikhao

امیرِ شہر غریبوں کو لُوٹ لیتا ہے
کبھی بہ حیلہء مذہب کبھی بنامِ وطن

ہوائے دہر سے دل کا چراغ کیا بجھتا
مگر فراز سلامت ہے یار کا دامن

ہم تو یوں خوش تھے کہ اک تار گریبان میں ہے
کیا خبر تھی کہ بہار اس کے بھی ارمان میں ہے

ایک ضرب اور بھی اے زندگیِ تیشہ بدست
سانس لینے کی سکت اب بھی مری جان میں ہے

میں تجھے کھو کے بھی زندہ ہوں یہ دیکھا تو نے
کس قدر حوصلہ ہارے ہوئے انسان میں ہے

فاصلے قرب کے شعلوں کو ہوا دیتے ہیں
میں ترے شہر سے دُور اور تُو مرے دھیان میں ہے
سرِ دیوار فروزاں ہے ابھی ایک چراغ
اے نسیمِ سحری! کچھ ترے امکان میں ہے

دل دھڑکنے کی صدا آتی ہے گاہے گاہے
جے سے اب بھی تری آواز مرے کان میں ہے

خلقتِ شہر کے ہر ظلم کے باوصف فرازؔ
ہائے وہ ہاتھ کہ اپنے ہی گریبان میں ہے

خاموش ہو کیوں دادِ جفا کیوں نہیں دیتے
بسمل ہو تو قاتل کو دعا کیوں نہیں دیتے

وحشت کا سبب روزنِ زنداں تو نہیں ہے
مہر و مہ و انجم کو بجھا کیوں نہیں دیتے

اِک یہ بھی تو اندازِ علاجِ غمِ جاں ہے
اے چارہ گرو! درد بڑھا کیوں نہیں دیتے

منصف ہو اگر تم تو کب انصاف کرو گے
مجرم ہیں اگر ہم تو سزا کیوں نہیں دیتے

رہزن ہو تو حاضر ہے متاعِ دل و جاں بھی
رہبر ہو تو منزل کا پتہ کیوں نہیں دیتے

کیا بیت گئی اب کے فراز اہلِ چمن پر
یارانِ قفس مجھ کو صدا کیوں نہیں دیتے

اظہار

پتھر کی طرح اگر میں چپ رہوں
تو یہ نہ سمجھ کہ میری ہستی
بیگانہ شعلۂ وفا ہے
تحقیر سے یوں نہ دیکھ مجھے
اے سنگ تراش! تیرا تیشہ
ممکن ہے کہ ضربِ اولیں سے
پہچان سکے کہ میرے دل میں
جو آگ ترے لئے دبی ہے
وہ آگ ہی میری زندگی ہے

خودکشی

وہ پیمان بھی ٹوٹے جن کو
ہم سمجھے تھے پایندہ

وہ شمعیں بھی داغ ہیں جن کو
برسوں رکھا تابندہ

دونوں وفا کر کے ناخوش ہیں
دونوں کیے پر شرمندہ

پیارے سے پیارا جیون پیارے
کیا ماضی کیا آیندہ

ہم دونوں اپنے قاتل ہیں
ہم دونوں اب تک زندہ

پیغام seekho aur sikhao

سُن بھی اے نغمہ سنجِ کنجِ چمن اب سماعت کا اعتبار کسے
کون سا پیرہن سلامت ہے دیجیے دعوتِ بہار کسے

جل بجھیں دردِ ہجر کی شمعیں گھل چکے نیم سوختہ پیکر
سر میں سودائے خام ہو بھی تو کیا طاقت و تابِ انتظار کسے

نقدِ جاں بھی تو نذر کر آئے اور ہم مفلسوں کے پاس تھا کیا
کون ہے اہلِ دل میں اتنا غنی اس قدر پاس طبعِ یار کسے

کاہشِ ذوق جستجو معلوم داغ ہے دل چراغ ہیں آنکھیں
ماتمِ شہرِ آرزو کیجیے فرصتِ نغمۂ قرار کسے

کون دارائے ملکِ عشق ہُوا کس کو جاگیر چشم و زلفِ ملی
خونِ فرہاد، بر سرِ فرہاد قصرِ شیریں پہ اختیار کسے

حاصلِ مشربِ مسیحائی سنگِ تحقیر و مرگِ رسوائی
قامتِ یار ہو کہ رفعتِ دار ان صلیبوں کا اعتبار کسے

دل بہلتا ہے کہاں انجم و مہتاب سے بھی
اب تو ہم لوگ گئے، دیدۂ بے خواب سے بھی

رو پڑا ہوں تو کوئی بات ہی ایسی ہو گی
میں کہ واقف تھا ترے ہجر کے آداب سے بھی

کچھ تو اس آنکھ کا شیوہ ہے خفا ہو جانا
اور کچھ بھول ہوئی ہے دلِ بے تاب سے بھی

اے سمندر کے ہَوا تیرا کرم بھی معلوم
پیاس ساحل کی تو بجھتی نہیں سیلاب سے بھی

کچھ تو اُس حسن کو جانے ہے زمانہ سارا
اور کچھ بات چلی ہے مرے احباب سے بھی

دل کبھی غم کے سمندر کا شناور تھا فرازؔ
اب تو خوف آتا ہے اک موجۂ پایاب سے بھی

وفا کے باب میں الزامِ عاشقی نہ لیا
کہ تیری بات بھی کی اور تیرا نام بھی نہ لیا

خوشا وہ لوگ کہ محرومِ التفات رہے
ترے کرم کو بہ اندازِ سادگی نہ لیا

تمہارے بعد کئی ہاتھ دل کی سمت بڑھے
ہزار شکر گریباں کو ہم نے سی نہ لیا

تمام مستی و تشنہ لبی کے ہنگامے
کسی نے سنگ اٹھایا کسی نے مینا لیا

فرازؔ ظلم ہے اتنی خود اعتمادی بھی
کہ رات بھی تھی اندھیری چراغ بھی نہ لیا

پیغام seekho aur sikhao

شکست

بارہا مجھ سے کہا دل نے کہ اے شعبدہ گر
تو کہ الفاظ سے اصنام گری کرتا ہے
کبھی اس حسنِ دل آرا کی بھی تصویر بنا
جو تری سوچ کے حجروں میں لہو بھرتا ہے

پیغام
seekho aur sikhao

بارہا دل نے یہ آواز سنی اور چاہا
مان لوں مجھ سے جو وجدان میرا کہتا ہے
لیکن اس عجز سے ہارا میرے فن کا جادو
چاند کو چاند سے بڑھ کر کوئی کیا کہتا ہے

زیرِ لب

کس بوجھ سے جسم ٹوٹتا ہے
اتنا تو کڑا سفر نہیں تھا
دو چار قدم کا فاصلہ کیا
پھر راہ سے بے خبر نہیں تھا
لیکن یہ تھکن یہ لڑکھڑاہٹ
یہ حال تو عمر بھر نہیں تھا

پیغام seekho aur sikhao

آغازِ سفر میں جب چلے تھے
کب ہم نے کوئی دیا جلایا
کب عہدِ وفا کی بات کی تھی
کب ہم نے کوئی فریب کھایا
وہ شام وہ چاندنی وہ خوشبو
منزل کا کسے خیال آیا

تُو محوِ سخن تھی مجھ سے لیکن
میں سوچ کے جال بُن رہا تھا
میرے لئے زندگی تڑپ تھی
تیرے لئے غم بھی قہقہہ تھا
اب تجھ سے بچھڑ کے سوچتا ہوں
کچھ تُو نے کہا تھا! کیا کہا تھا۔۔۔

پیغام
seekho aur sikhao

ایسے چپ ہیں کہ یہ منزل بھی کڑی ہو جیسے
تیرا ملنا بھی جدائی کی گھڑی ہو جیسے

اپنے ہی سائے سے ہر گام لرز جاتا ہوں
راستے میں کوئی دیوار کھڑی ہو جیسے

کتنے ناداں ہیں ترے بھولنے والے کہ تجھے
یاد کرنے کے لیئے عمر پڑی ہو جیسے

تیرے ماتھے کی شکن پہلے بھی دیکھی تھی مگر
یہ گرہ اب کے مرے دل میں پڑی ہو جیسے

منزلیں دور بھی ہیں منزلیں نزدیک بھی ہیں
اپنے ہی پاؤں میں زنجیر پڑی ہو جیسے

آج دل کھول کے روئے ہیں تو یوں خوش ہیں فرازؔ
چند لمحوں کی یہ راحت بھی بڑی ہو جیسے

کیا ایسے کم سُخن سے کوئی گفتگو کرے
جو مستقل سکوت سے دل کو لہو کرے

اب تو ہمیں بھی ترکِ مراسم کا دُکھ نہیں
پر دل یہ چاہتا ہے کہ آغاز تو کرے

تیرے بغیر بھی تو غنیمت ہے زندگی
خود کو گنوا کے کون تری جستجو کرے

اب تو یہ آرزو ہے کہ وہ زخم کھائیے
تا زندگی یہ دل نہ کوئی آرزو کرے

تجھ کو بھُلا کے دل ہے وہ شرمندۂ نظر
اب کوئی حادثہ ہی ترے روبرو کرے

چپ چاپ اپنی آگ میں جلتے رہو فرازؔ
دنیا تو عرضِ حال سے بے آبرو کرے

ہر ایک بات سنہ کیوں زہر سی ہماری لگے
کہ ہم کو دستِ زمانہ کے زخم کاری لگے

اداسیاں ہوں مسلسل تو دل نہیں روتا
کبھی کبھی ہو تو یہ کیفیت بھی پیاری لگے

بظاہر ایک ہی شب ہے فراقِ یار مگر
کوئی گزارنے بیٹھے تو عمر ساری لگے

علاج اس دلِ درد آشنا کا کیا کیجئے
کہ تیر بن کے جسے حرفِ غمگاری لگے

ہماری پاس بھی بیٹھو بس اتنا چاہتے ہیں
ہمارے ساتھ طبیعت اگر تمہاری لگے

فرازؔ تیرے جنوں کا خیال ہے ورنہ
یہ کیا ضرور وہ صورت سبھی کو پیاری لگے

ہمدرد

اے دل ان آنکھوں پر نہ جا
جن میں وفورِ رنج سے
کچھ دیر کو تیرے لیئے
آنسو اگر لہرا گئے

پیغام
seekho aur sikhao

یہ چند لمحوں کی چمک
جو تجھ کو پاگل کر گئی!
ان جگنوؤں کے نور سے
چمکی ہے کب وہ زندگی
جس کے مقدر میں رہی
صبحِ طلب سے تیرگی

کس سوچ میں گم سم ہے تو
اے بے خبر! ناداں نہ بن
تیری فسردہ روح کو
چاہت کے کانٹوں کی طلب
اور اس کے دامن میں فقط
ہمدردیوں کے پھول ہیں

پیغام
seekho aur sikhao

خواب

وہ چاند جو میرا ہمسفر تھا
دوری کے اجاڑ جنگلوں میں
اب میری نظر سے چھپ چکا ہے

اِک عمر سے میں ملول و تنہا
ظلمات کی راہگزر میں ہوں
میں آگے بڑھوں کہ لوٹ جاؤں

کیا سوچ کے انتظار میں ہوں
کوئی بھی نہیں جو یہ بتائے
میں کون ہوں کس دیار میں ہوں

پیغام seekho aur sikhao

سو دوریوں پہ بھی مرے دل سے جدا نہ تھی
تو میری زندگی تھی مگر بے وفا نہ تھی

دل نے ذرا سے غم کو قیامت بنا دیا
ورنہ وہ آنکھ اتنی زیادہ خفا نہ تھی

پیغام
seekho aur sikhao

یوں دل لرز اٹھا ہے کسی کو پکار کر
میری صدا بھی جیسے کہ میری صدا نہ تھی

برگِ خزاں جو شاخ سے ٹوٹا وہ خاک تھا
اس جاں سپردگی کے تو قابل ہوا نہ تھی

جگنو کی روشنی سے بھی کیا کیا بھڑک اٹھی
اس شہر کی فضا کہ چراغ آشنا نہ تھی

مرہونِ آسماں جو رہے ان کو دیکھ کر
خوش ہوں کہ میرے ہونٹوں پہ کوئی دعا نہ تھی

پیغام
seekho aur sikhao

ہر جسم داغ داغ تھا لیکن فرازؔ ہم
بدنام یوں ہوئے کہ بدن پر قبا نہ تھی

جو بھی دکھ یاد نہ تھا یاد آیا
آج کیا جانیے کیا یاد آیا

پھر کوئی ہاتھ ہے دل پر جیسے
پھر ترا عہد وفا یاد آیا

جس طرح دھند میں لپٹے ہوئے پھول
ایک اک نقش ترا یاد آیا

ایسی مجبوری کے عالم میں کوئی
یاد آیا بھی تو کیا یاد آیا

اے رفیقو سر منزل جا کر
کیا کوئی آبلہ پا یاد آیا

یاد آیا تھا بچھڑنا تیرا
پھر نہیں یاد کہ کیا یاد آیا

پیغام
seekho aur sikhao

جب کوئی زخم بھرا داغ بنا
جب کوئی بھول گیا یاد آیا

یہ محبت بھی ہے کیا روگ فرازؔ
جس کو بھولے وہ سدا یاد آیا

سوال

ایک سنگ تراش جس نے برسوں
ہیروں کی طرح صنم تراشے
آج اپنے صنم کدے میں تنہا
مجبور، نڈھال، زخم خوردہ
دن رات پڑا کراہتا ہے

چہرے پہ اجاڑ زندگی کے
لمحات کی ان گنت خراشیں
آنکھوں کے شکستہ مرقدوں میں
روٹھی ہوئی حسرتوں کی لاشیں

پیغام seekho aur sikhao

سانسوں کی تھکن بدن کی ٹھنڈک
احساس سے کب تلک لہو لے
ہاتھوں میں کہاں سکت کے بڑھ کر
خود ساختہ پیکروں کو چھو لے

یہ زخمِ طلب یہ نامرادی
ہر بت کے لبوں پہ ہے تبسم
اے تیشہ بدست دیوتاؤ!
تخلیق عظیم ہے کہ خالق؟
انسان جواب چاہتا ہے!

پیغام seekho aur sikhao

غریب شہر کے نام

غریب شہر تری دکھ بھری نوا پہ سلام
تری طلب، تیری چاہت، تری وفا پہ سلام
ہر ایک حرفِ تمنائے دل ربا پہ سلام
حدیثِ درد و سکوتِ سخن ادا پہ سلام

پیغام
seekho aur sikhao

دریدہ دل، ترے آہنگ ساز غم پہ نثار
گہر فروش! ترے رنگ چشم نم پہ نثار

جنوں کا شہر ہے آباد فصل دار کی خیر
ہر ایک دل ہے گریبان بھری بہار کی خیر
بجے یہیں بام مگر شمع رہگزار کی خیر
تمام عمر تو گزرے اس انتظار کی خیر

رخِ نگار و غمِ یار کو نظر نہ لگے
گلہ نہیں اگر آنکھ عمر بھر نہ لگے

دل و نظر کی شکستوں کا کیا شمار کریں
شمارِ زخم عبث ہے نجات سے پہلے
کچھ اور دیدہ خوں رنگ کو گلاب کریں
صبا کا ذکر قیامت ہے، رات سے پہلے

ابھی لبوں پہ حکایتِ خوں کچیدہ سہی
بہ سینہ رہ سپرم و پا بریدہ سہی

زخم کو پھول تو صَرصَر کو صبا کہتے ہیں
جانے کیا دور ہے، کیا لوگ ہیں، کیا کہتے ہیں

کیا قیامت ہے کہ جن کے لئے رک رک کے چلے
اب وہی لوگ ہمیں آبلہ پا کہتے ہیں

کوئی بتلاؤ کہ اک عمر کا بچھڑا محبوب
اتفاقاً کہیں مل جائے تو کیا کہتے ہیں

یہ بھی اندازِ سخن ہے کہ جفا کو تیری
غمزہ و عشوہ و انداز و ادا کہتے ہیں

جب تلک دور ہے تو تیری پرستش کر لیں
ہم جسے چھو نہ سکیں اس کو خدا کہتے ہیں

کیا تعجب ہے کہ ہم اہلِ تمنا کو فرازؔ
وہ جو محرومِ تمنا ہیں برا کہتے ہیں

گل ہوا چراغ مے تو سزوار سنگ ہیں
مینا سرشت ہم بھی شہیدان رنگ ہیں

مطرب کی بے دلی ہے کہ محفل کی بے حسی
کس تیغ سے ہلاک نواہائے چنگ ہیں

دل خلوت خیال کی آرائشوں میں گم
آنکھیں نگار خانہ ہستی پہ دنگ ہیں

تاب و تواں نہیں ہے مگر حوصلے تو دیکھ
شیشہ صفات پھر بھی حریفانِ سنگ ہیں

اے حسن سادہ دل تری رسوائیاں نہ ہوں
کچھ لوگ کشتہ ہوسِ نام و ننگ ہیں

معذور ہیں تلون خاطر کو کیا کریں
ہم خود فرازؔ اپنی طبیعت سے تنگ ہیں

وہی جنوں ہے، وہی کوچہِ ملامت ہے
شکستِ دل پہ بھی عہدِ وفا سلامت ہے

یہ ہم جو باغ و بہاراں کا ذکر کرتے ہیں
تو مدّعا گلِ تر وہ سروقامت ہے

بجا یہ فرصتِ ہستی مگر دلِ ناداں
نہ یاد کر کے اُسے بھولنا قیامت ہے

چلی چلے یونہی رسمِ وفا و مشقِ ستم
کہ تیغِ یار و سرِ دوستاں سلامت ہے

سکوتِ بحر سے ساحل لرز رہا ہے مگر
یہ خامشی کسی طوفان کی علامت ہے

عجیب وضع کا احمد فرازؔ ہے شاعر
کہ دل دریدہ مگر پیرہن سلامت ہے

پیغام بر

میں کوئی کرنوں کا سوداگر نہیں
اپنے اپنے دکھ کی تاریکی لیے
تم آ گئے کیوں میرے پاس
غم کے انبار کو کاندھوں پر دھرے
بوجھل صلیبوں کی طرح
آشفتہ مُواَفسردہ رُو خونیں لباس
ہونٹ محرومِ تکلم پر سراپا التماس
اس تمنا پر کہ تم کو مل سکے
غم کے انباروں کے بدلے
مسکراہٹ کی کرن۔۔۔۔۔۔۔ جینے کی آس
میں مگر کرنوں کا سوداگر نہیں
میں نہیں جوہر شناس

پیغام seekho aur sikhao

صورتِ انبوہِ دریوزہ گراں
سب کے دل ہیں قہقہوں سے چُور
لیکن آنکھ سے آنسو رواں
سب کے سینوں میں امیدوں کے چراغاں
اور چہروں پر شکستوں کا دھواں
زندگی سب سے گریزاں
سوے مقتل سب رواں
سب نحیف و ناتواں
سب کے سب اک دوسرے کے ہم سفر
اک دوسرے سے بدگماں
سب کی آنکھوں میں خیالِ مرگ سے خوف و ہراس

میری باتوں سے مری آواز سے
تم نے یہ جانا کہ میں بھی
لے کے آیا ہوں تمہارے واسطے وہ معجزے
جن سے بھر جائیں گے پل بھر میں تمہارے
اَن گنت صدیوں کے لاتعداد زخم

دم بخود سانسوں کو ٹھہرائے ہوئے بے جان جسم
منتظر ہیں قُم بِاذِنِی کی صدائے سحر کے

ایشیا پیغمبروں کی سرزمیں
اور تم اس کے زبوں قسمت مکیں۔۔۔۔تیرہ جبیں
من و سلوٰی کے لیے دامن کشا
قحط خوردہ زار و بیمار و حزیں
صرف تقدیر و توکل پر یقیں

پیغام
seekho aur sikhao

تم کو شیرینِ طرب کی چاہ لیکن بے ستونِ غم کی سِل کو
چیرنے کا حوصلہ، یارا نہیں
تم یدِ بیضا کے قائل، بازوئے فرہاد کی قوت سے بہرہ ور نہیں
تم کہ ہو کوہہ گرفتہ۔۔۔۔زندگی سے دور
مردہ ساحروں کی بے نشاں قبروں کے سجادہ نشیں
خاکداں کی اس گِل تاریک کا
میں بھی اک پیکر ہوں، پیکر گر نہیں
میں کوئی کرنوں کا سوداگر نہیں

ریت کے تپتے ہوے ٹیلوں پہ استادہ ہو تم
سایہِ ابرِ رواں کو دیکھتے رہنا تمہارا جزوِ دیں
سات قتلزم موجزن چاروں طرف
اور تمہارے بخت میں شبنم نہیں

اپنے اپنے دکھ کی بوجھل گٹھڑیوں کو
تم نے کھولا ہے کبھی؟
اپنے ہم جنسوں کے سینوں کو ٹٹولا ہے کبھی؟
سب کی روحیں گرسنہ۔۔۔۔ سب کی متاعِ درد میں
دوسروں کا خون پینے کی ہوس
ایک دوسرے کا دکھ کم نہیں
ایک کا دکھ تشنگی، بیچارگی
دوسروں کا دکھ مگر افراطِ مے۔۔۔۔ دیوانگی

پیغام seekho aur sikhao

پیاس اور نشے کا دکھ
اپنے انباروں سے مل کر چھانٹ لو
پیاس اور نشے کا دکھ ایک دوسرے میں بانٹ لو
پھر تمہاری زندگی شاید نہ ہو
شاکیِ عرشِ بریں و رحمت اللعالمین
میں کوئی کرنوں کا سوداگر نہیں

پیغام
seekho aur sikhao

روز کی مسافت سے چُور ہو گئے دریا
پتھروں کے سینوں پر تھک گئے، سو گئے دریا

جانے کون کاٹے گا فصلِ لعل و گوہر کی
رتیلی زمینوں میں سنگ بو گئے دریا
اے سحابِ غم کب تک یہ گریز آنکھوں سے
انتظارِ طوفان میں خشک ہو گئے دریا

چاندنی میں آتی ہے کس کو ڈھونڈنے خوشبو
ساحلوں کے پھولوں کو کب سے رو گئے دریا
بجھ گئی ہیں قندیلیں خواب ہو گئے چہرے
آنکھ کے جزیروں کو پھر ڈبو گئے دریا

دل چٹان کی صورت سیلِ غم پہ ہنستا ہے
جب نہ بن پڑا کچھ بھی داغ دھو گئے دریا
زخمِ نامرادی سے ہم فرازؔ زندہ ہیں
دیکھنا سمندر میں غرق ہو گئے دریا

تو کہ انجان ہے اس شہر کے آداب سمجھ
پھول روئے تو اُسے خندۂ شاداب سمجھ

کہیں آسودگی آجائے میسر تو مقدر تیرا
ورنہ آسودگیِ دہر کو نایاب سمجھ

حسرتِ گریہ میں جو آگ ہے اشکوں میں نہیں
خشک آنکھوں کو مری چشمۂ بے آب سمجھ

موجِ دریا ہی کو آوارۂ صد شوق نہ کہہ
ریگِ ساحل کو بھی لب تشنۂ سیلاب سمجھ

یہ بھی واہے کسی مانوس کرن کی خاطر
روزنِ در کو بھی اک دیدۂ بے خواب سمجھ

اب کسے ساحلِ امید سے تکتا ہے فرازؔ
وہ جو ایک کشتیِ دل تھی اُسے غرقاب سمجھ

خدائے برتر

خدائے برتر

مری محبت

تری محبت کی رفعتوں سے عظیم تر ہے

تری محبت کا درخورِ اعتنا

فقط بے کراں سمندر

کہ جس کی خاطر

سدا تری رحمتوں کے بادل

کبھی کسی آبشار کی نغمگی کے موتی

کبھی کسی آبجو کے آنسو

کبھی کسی جھیل کے ستارے

کہیں سے شبنم کہیں سے چشمے کہیں سے دریا اڑا کے لائے

کہ تیرے محبوب کو جلال و جمال بخشیں

تری محبت تو اس شہنشاہ کی طرح ہے

جو دوسروں کے ہنر سے، خونِ جگر سے

پیغام seekho aur sikhao

اپنی وفا کو دوام بخشے
مگر مری بے بساط چاہت
فقط مرے آنسوؤں سے
مرے لہو سے۔۔۔ میری ہی آبرو سے
رہی ہے زندہ
اگرچہ اس بے بضاعتی نے
مجھے ہمیشہ شکست دی ہے
مگر یہ ناکامیِ تماشا بھی
اس محبت سے کامراں تر عظیم تر ہے
جو اپنی سطوت کے بل پر
اوروں کی آہ زاری سے
اپنے جذبِ وفا کی تشہیر چاہتی ہے
جو بھی نامِ حبیب سے کر دیا معنون
وہ حرف میرا ہے، میرا اپنا ہے
اے خدائے بزرگ و برتر

پیغام seekho aur sikhao

قرب جز داغِ جدائی نہیں دیتا کچھ بھی
تو نہیں ہے تو دکھائی نہیں دیتا کچھ بھی

دل کے زخموں کو نہ رو، دوست کا احسان سمجھ
ورنہ وہ دستِ حنائی نہیں دیتا کچھ بھی

کیا اِسی زہر کو تریاق سمجھ کر پی لیں
ناصحوں کو تو سجھائی نہیں دیتا کچھ بھی

ایسا گم ہوں تری یادوں کے بیابانوں میں
دل نہ دھڑکے تو سنائی نہیں دیتا کچھ بھی

سوچتا ہوں تو ہر اک نقش میں دنیا آباد
دیکھتا ہوں تو دکھائی نہیں دیتا کچھ بھی

یوسفِ شعر کو کس مصر میں لائے ہو فرازؔ
ذوقِ آشفتہ نوائی نہیں دیتا کچھ بھی

دوست بن کر بھی نہیں ساتھ نبھانے والا
وہی انداز ہے ظالم کا زمانے والا

اب اُسے لوگ سمجھتے ہیں گرفتار مرا
سخت نادم ہے مجھے دام میں لانے والا

صبحدم چھوڑ گیا نکہتِ گُل کی صورت
رات کو غنچۂ دل میں سمٹ آنے والا

کیا کہیں کتنے مراسم تھے ہمارے اس سے
وہ جو اک شخص ہے منہ پھیر کے جانے والا

تیرے ہوتے ہوئے آجاتی تھی ساری دنیا
آج تنہا ہوں تو کوئی نہیں آنے والا

منتظر کس کا ہوں ٹوٹی ہوئی دہلیز پہ میں
کون آئے گا یہاں کون ہے آنے والا

کیا خبر تھی جو مری جان میں گھُلا ہے اتنا
وہی ہے مجھ کو سرِ دار بھی لانے والا

میں نے دیکھا ہے بہاروں میں چمن کو جلتے
ہے کوئی خواب کی تعبیر بتانے والا

تم تکلف کو بھی اخلاص سمجھتے ہو فرازؔ
دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا

یہ عالم شوق کا دیکھا نہ جائے
وہ بت ہے یا خدا دیکھا نہ جائے

یہ کن نظروں سے تو نے آج دیکھا
کہ تیرا دیکھنا دیکھا نہ جائے

ہمیشہ کے لیے مجھ سے بچھڑ جا
یہ منظر بارہا دیکھا نہ جائے

غلط ہے جو سنا، پر آزما کر
تجھے اے بیوفا دیکھا نہ جائے

یہ محرومی نہیں پاسِ وفا ہے
کوئی تیرے سوا دیکھا نہ جائے

یہی تو آشنا بنتے ہیں آخر
کوئی نا آشنا دیکھا نہ جائے

یہ میرے ساتھ کیسی روشنی ہے
کہ مجھ سے راستہ دیکھا نہ جائے

فراز آپنے سوا ہے کون تیرا
تجھے تجھ سے جدا دیکھا نہ جائے

پیغام seekho aur sikhao

خود غرض

اے دل، اپنے درد کے کارن تو کیا کیا بیتاب رہا
دن کے ہنگاموں میں ڈوبا راتوں کو بے خواب رہا
لیکن تیرے زخم کا مرہم تیرے لیے نایاب رہا

پیغام
seekho aur sikhao

پھر ایک انجانی صورت نے ترے دکھ کے گیت سنے
اپنی سندرتا کی کرنوں سے چاہت کے خواب بُنے
خود کانٹوں کی باڑھ سے گزری تری راہ میں پھول چنے

اے دل، جس نے تری محرومی کے داغ کو دھویا تھا
آج اسکی آنکھیں پرنم تھیں اور تُو سوچ میں کھویا تھا
دیکھ پرائے دکھ کی خاطر تو بھی تو کبھی یوں رویا تھا؟

وابستگی

آ گئی پھر وہی پہاڑ سی رات
دوش پر ہجر کی صلیب لئے
ہر ستارہ ہلاکِ صبحِ طلب
منزلِ خواہشِ حبیب لئے

پیغام seekho aur sikhao

اس سے پہلے بھی شامِ وصل کے بعد
کاروانِ دل و نگاہ چلا
اپنی اپنی صلیب اٹھائے ہوئے
ہر کوئی سوئے قتل گاہ چلا

کتنی بانہوں کی ٹہنیاں ٹوٹیں
کتنے ہونٹوں کے پھول چاک ہوئے

کتنی آنکھوں سے چھن گے موتی
کتنے چہروں کے رنگ خاک ہوئے

پھر بھی ویراں نہیں ہے کوئے مراد
پھر بھی شبِ زندہ دار ہیں زندہ
پھر بھی روشن ہے بزمِ رسمِ وفا
پھر بھی ہیں کچھ چراغ تابندہ

وہی قاتل جو اپنے ہاتھوں سے
ہر مسیحا کو دار کرتے ہیں
پھر اسی کی مراجعت کے لیے
حشر تک انتظار کرتے ہیں

پیغام seekho aur sikhao

دل بھی بجھا ہو شام کی پرچھایاں بھی ہوں
مر جایئے جو ایسے میں تنہائیاں بھی ہوں

آنکھوں کی سرخ لہر ہے موجِ سپردگی
یہ کیا ضرور ہے کہ اب انگڑائیاں بھی ہوں

ہر حُسن سادہ لوح نہ دل میں اتر سکا
کچھ تو مزاجِ یار میں گہرائیاں بھی ہوں

پیغام
seekho aur sikhao

دنیا کے تذکرے تو طبیعت ہی لے بجھے
بات اسکی ہو تو پھر سخن آرائیاں بھی ہوں

پہلے پہل کا عشق ابھی یاد ہے فرازؔ
دل خود یہ چاہتا تھا کہ رسوائیاں بھی ہوں

جب تری یاد کے جگنو چمکے
دیر تک آنکھ میں آنسو چمکے

سخت تاریک ہے دل کی دنیا
ایسے عالم میں اگر تُو چمکے

ہم نے دیکھا سرِ بازارِ وفا
کبھی موتی کبھی آنسو چمکے

شرط ہے شدتِ احساسِ جمال
رنگ تو رنگ ہے خوشبو چمکے

آنکھ مجبورِ تماشا ہے فرازؔ
ایک صورت ہے کہ ہر سُو چمکے

ممدوح

میں نے کب کی ہے ترے کاکل ولب کی تعریف
میں نے کب لکھے قصیدے ترے رخساروں کے
میں نے کب تیرے سراپا کی حکایات کہیں
میں نے کب شعر کہے جھومتے گلزاروں کے
جانے دو دن کی محبت میں یہ بہکے ہوئے لوگ
کیسے افسانے بنا لیتے ہیں دلداروں کے

پیغام
seekho aur sikhao

میں کہ شاعر تھا مرے فن کی روایت تھی یہی
مجھ کو اک پھول نظر آئے تو گلزار کہوں
مسکراتی ہوئی ہر آنکھ کو قاتل جانوں
ہر نگاہِ غلط انداز کو تلوار کہوں
میری فطرت تھی کہ میں حسنِ بیاں کی خاطر
ہر حسیں لفظ کو درِ مدحِ رخِ یار کہوں

میرے دل میں بھی کھلے ہیں تری چاہت کے کنول
ایسی چاہت کہ جو وحشی ہو تو کیا کیا نہ کرے
مجھے گر ہو بھی تو کیا زعمِ طوافِ شعلہ
تو ہے وہ شمع کہ پتھر کی بھی پرواہ نہ کرے
میں نہیں کہتا کہ تجھ سا ہے نہ مجھ سا کوئی
ورنہ شوریدگیِ شوق تو دیوانہ کرے

پیغام
seekho aur sikhao

کیا یہ کم ہے کہ ترے حسن کی رعنائی سے
میں نے وہ شمعیں جلائی ہیں کہ مہتاب نثار
تیرے پیمانِ وفا سے مرے فن نے سیکھی
وہ دل آویز صداقت کہ کئی خواب نثار
تیرے غم نے مرے وجدان کو بخشی وہ کسک
مرے دشمن مرے قاتل، مرے احباب نثار

میں کسی غم میں بھی رویا ہوں تو میں نے دیکھا
تیرے دکھ سے کوئی مجروح نہیں تیرے سوا
میرے پیکر میں تری ذات گھلی ہے اتنی
کہ مرا جسم مری روح نہیں تیرے سوا
میرا موضوعِ سخن تُو ہو کہ ساری دنیا
درحقیقت کوئی ممدوح نہیں تیرے سوا

پیغام
seekho aur sikhao

پیام آئے ہیں اس یارِ بے وفا کے مجھے
جسے قرار نہ آیا کہیں بھلا کے مجھے

جدائیاں ہوں تو ایسی کہ عمر بھر نہ ملیں
فریب دو تو ذرا سلسلے بڑھا کے مجھے

نشے سے کم تو نہیں یادِ یار کا عالم
کہ لے اڑا ہے کوئی دوش پر ہوا کے مجھے

میں خود کو بھول چکا تھا مگر جہاں والے
اداس چھوڑ گئے آئینہ دکھا کے مجھے

تمہارے بام سے اب کم نہیں ہے رفعتِ دار
جو دیکھنا ہو تو دیکھو نظر اٹھا کے مجھے

کھنچی ہوئی ہے مرے آنسوؤں میں اک تصویر
فرازؔ دیکھ رہا ہے وہ مسکرا کے مجھے

بے نیازِ غمِ پیمانِ وفا ہو جانا
تم بھی اوروں کی طرح مجھ سے جدا ہو جانا

میں بھی پلکوں پہ سجا لوں گا لہو کی بوندیں
تم بھی پابستۂ زنجیرِ حنا ہو جانا

گرچہ اب قرب کا امکاں ہے بہت کم پھر بھی
کہیں مل جائیں تو تصویر نما ہو جانا

صرف منزل کی طلب ہو تو کہاں ممکن ہے
دوسروں کے لیے خود آبلہ پا ہو جانا

خلق کی سنگ زنی میری خطاؤں کا صلہ
تم تو معصوم ہو، تم دور ذرا ہو جانا

اب مرے واسطے تریاق ہے الحاد کا زہر
تم کسی اور پجاری کے خدا ہو جانا

اے نگارِ گُل

نگارِ گل تجھے وہ دن بھی یاد ہوں شاید
کہ جن کے ذکر سے اب دل پہ تازیانہ لگے
تری طلب میں وہ دار و رسن کے ہنگامے
کہ جن کی بات کریں بھی تو اب فسانہ لگے
بقدرِ ذوق جلاتے رہے لہو کے چراغ
کہ تُو جب آئے تو یہ گھر نگار خانہ لگے
اِسی خیال سے ہر زخم اپنے دل پہ سہا
کہ تجھ کو گردشِ ایّام کی ہوا نہ لگے
مگر جو گزری ہے ہم پر ترے حصول کے بعد
وہ حالِ غم بھی کہیں، گر تجھے بُرا نہ لگے

نگارِ گُل وہ ہمیں تھے ترے تمنائی
کہ جن کے خوں سے ترے رنگ تابناک ہوئے
ہمیں ہیں جن سے قبا تیری لالہ رنگ ہوئی

ہمیں ہیں وہ جو تری رہگزر میں خاک ہوئے
خزاں تو خیر ستم کیشیوں کی رُت تھی مگر
بہار میں بھی ہمارے جگر ہی چاک ہوئے
ہمیں منارۂ کسریٰ کو توڑنے والے
ترے حریم میں آکر ہمیں ہلاک ہوئے

نگارِ گُل یہ تقاضا مگر وفا کا ہے
کہ اب بھی ہم ترے وعدوں کا اعتبار کریں
گزر گئی جو گزرنی تھی سخت جانوں پر
پھر آج تیری جفاؤں کا کیا شمار کریں
الم گزیدہ سہی پیرہن دریدہ سہی
مگر لبوں پہ غمِ دل نہ آشکار کریں
یہی اصول رہا ہے وفا پرستوں کا
ہر ایک حال میں توصیفِ حسنِ یار کریں
جبیں سے دھو کے ہر اک نقشِ نامرادی کا
نگارِ گُل ترے جلووں کا انتظار کریں

گُلشدہ شمعوں کا ماتم نہ کرو

عمر گزری ہے سجاتے ہوئے بام و در کو
اس تمنا پہ کہ وہ جانِ بہار آئے گی
فرشِ رہ دیدہ و دل تھے کہ وہ آسودہ خرام
درد کی آگ کو گلزار بنا جائے گی
اس توقع پہ خرابے رہے آغوش کشا
کھل کے برسے گی اگر اب کے گھٹا چھائے گی

پیغام
seekho aur sikhao

ایک اک لمحہ قیامت کی طرح گزرا ہے
آخر کار وہ محبوبِ نظر بھی آئی
منتظر آنکھیں تو پتھرا ہی چکی تھیں لیکن
کشتگانِ شبِ فرقت کی سحر بھی آئی
جسم کیوں شل ہیں دھڑکتے ہوئے دل کیوں چپ ہیں
جرسِ گل کی تو آواز ادھر بھی آئی

آج پھر کرتے ہو کس زعم پہ زخموں کا شمار
سر پھرو، وادیٔ پُر خار میں یہ تو ہو گا
کیوں نگاہوں میں ہے افسردہ چراغوں کا دُھواں
آرزوئے لب و رخسار میں یہ تو ہو گا
ایک سے ایک کڑی منزلِ جاں آئے گی
رہگزارِ طلبِ یار میں یہ تو ہو گا

ہونٹ سِل جائیں مگر جرأتِ اظہار رہے
دل کی آواز کو مدھم نہ کرو دیوانو
ڈھل چکی رات تو اب کہر بھی چھٹ جائے گی
اب بھی امید کی لو کم نہ کرو دیوانو
آندھیاں آیا ہی کرتی ہیں ہر اک حبس کے بعد
گلشدہ شمعوں کا ماتم نہ کرو دیوانو

دل میں اب طاقت کہاں خوننابہ افشانی کرے
ورنہ غم وہ زہر ہے پتھر کو بھی پانی کرے

عقل وہ ناصح کہ ہر دم لغزشِ پا کا خیال
دل وہ دیوانہ یہی چاہے کہ نادانی کرے

ہاں مجھے بھی ہو گلہ بے مہریٔ حالات کا
تجھ کو آزردہ اگر میری پریشانی کرے

یہ تو اک شہرِ جنوں ہے چاک دامانو، یہاں
سب کے سب وحشی ہیں کس کو کون زندانی کرے

موسمِ گل ہے مگر بے رنگ ہے شاخِ مژہ
کتنا شرمندہ ہمیں آنکھوں کی ویرانی کرے
ہنستے چہروں سے دلوں کے زخم پہچانے گا کون
تجھ سے بڑھ کر ظلم اپنی خندہ پیشانی کرے

ناصحوں کو کون سمجھائے، نہ سمجھے گا فرازؔ
وہ تو سب کی بات سن لے اور من مانی کرے

بے سروساماں تھے لیکن اتنا اندازہ نہ تھا
اِس سے پہلے شہر کے لُٹنے کا آوازہ نہ تھا

ظرفِ دل دیکھا تو آنکھیں کرب سے پتھرا گئیں
خون رونے کی تمنّا کا یہ خمیازہ نہ تھا

آ مرے پہلو میں آ اے رونقِ بزمِ خیال
لذتِ رخسار و لب کا اب تک اندازہ نہ تھا

پیغام
seekho aur sikhao

ہم نے دیکھا ہے خزاں میں بھی تری آمد کے بعد
کون سا گل تھا کہ گلشن میں تر و تازہ نہ تھا

ہم قصیدہ خواں نہیں اُس حسن کے لیکن فرازؔ
اتنا کہتے ہیں رہینِ سرمہ و غازہ نہ تھا

تپتے صحراؤں پہ گر جا سرِ دریا برسا
تھی طلب کس کو مگر ابر کہاں جا برسا

کتنے طوفانوں کی حامل تھی لہو کی ایک بوند
دل میں اک لہر اٹھی آنکھ سے دریا برسا

کوئی غرقاب کوئی ماہیٔ بے آب ہوا
ابرِ بے فیض جو برسا بھی تو کیا برسا

چڑھتے دریاؤں میں طوفان اٹھانے والے
چند بوندیں ہی سرِ دامنِ صحرا برسا

طنز ہیں سوختہ جانوں پہ گرجتے بادل
یا تو گھنگھور گھٹائیں نہ اٹھا، یا برسا
ابر و باراں کے خدا، جھومتا بادل نہ سہی
آگ ہی اب سرِ گلزارِ تمنّا برسا

اپنی قسمت کہ گھٹاؤں میں بھی جلتے ہیں فرازؔ
اور جہاں وہ ہیں وہاں ابر کا سایہ برسا

افعی کی طرح ڈسنے لگی موجِ نفس بھی
اے زہرِ غمِ یار بہت ہو چکی بس بھی

یہ حبس تو جلتی ہوئی رُت سے بھی گراں ہے
اے ٹھہرے ہوئے ابرِ کرم اب تو برس بھی

آئینِ خرابات، معطّل ہے تو کچھ روز
اے رندِ بلانوش و تہی جام ترس بھی

صیّاد و نگہبانِ چمن پر ہے یہ روشن
آباد ہمیں سے ہے نشیمن بھی قفس بھی

محرومیٔ جاوید گنہگار نہ کر دے
بڑھ جاتی ہے کچھ ضبطِ مسلسل سے ہوس بھی

پیغام seekho aur sikhao

اے مرے بیدرد شہر

دل سلگ اٹھتا ہے اپنے بام و در کو دیکھ کر
پھیلنے لگتی ہیں جب بھی شام کی پرچھائیاں
اس قدر ویران لمحے اس قدر سنسان رُت
سوچ میں گم ہیں افق سے تا افق پہنائیاں
کس لیے روشن کروں دیوار و در کوئی تو ہو
گنگ دیواروں میں کیا ہوں انجمن آرائیاں

پیغام seekho aur sikhao

دور ہر شب جاگ اٹھتے ہیں کئی ماہ و نجوم
آگ بھڑکاتی ہیں سنگ و خشت کی رعنائیاں
راستوں سے خوابگاہوں تک مسلسل موجِ رنگ
جس طرح قوسِ قزح کی ٹوٹتی انگڑائیاں
زخمِ نظارہ لیے آنکھوں میں چپ تکتا رہا
گو میری نیندیں بھی مجھ سے لے اڑیں شہنائیاں

کل ذرا سی دیر چمکے تھے مرے دیوار و در
جھلملا اٹھی تھیں میری روح کی گہرائیاں
چند لمحوں کے لیے لَو دے اٹھا تھا اِک چراغ
اور دمک اٹھی تھیں کچھ لمحے مری تنہائیاں
آج اتنا شور کیوں ہے اے مرے بیدرد شہر
ہر نظر میری طرف ہے اِس قدر رسوائیاں؟

پیغام seekho aur sikhao

گھر میں کتنا سناٹا ہے باہر کتنا شور
یا دنیا دیوانی ہے یا میرا دل ہے چور

کبھی تو آنکھوں کے گلزاروں میں بھی آکر ناچ
دل میں کون تجھے دیکھے گا اے جنگل کے مور

یوں پھرتے ہیں گلیوں میں گھبرائے گھبرائے سے
جیسے اِس بستی کے سائے بھی ہوں آدم خور

سوچ کی چنگاری بھڑکا کر کیا نادانی کی
اُس لمحے سے لیکر اب تک آگ ہے چاروں اور

چاک گریباں پھرنا کس کو خوش آتا ہے فرازؔ
ہم بھی اس کو بھول نہ جائیں دل پہ اگر ہو زور

پھر اسی رہگزار پر شاید
ہم کبھی مل سکیں مگر شاید

جن کے ہم منتظر رہے ان کو
مل گئے اور ہم سفر شاید

جان پہچان سے بھی کیا ہو گا
پھر بھی اے دوست غور کر، شاید

seekho aur sikhao

اجنبیت کی دھند چھٹ جائے
چمک اٹھے تری نظر شاید

زندگی بھر لہو رلائے گی
یادِ یارانِ بے خبر شاید

جو بھی بچھڑے ہیں وہ کب ملے ہیں فرازؔ
پھر بھی تُو انتظار کر شاید

اب وہ جھونکے کہاں صبا جیسے
آگ ہے شہر کی ہوا جیسے

شب سلگتی ہے دوپہر کی طرح
چاند، سورج سے جل بجھا جیسے

مدتوں بعد بھی یہ عالم ہے
آج ہی تو جدا ہُوا جیسے

اس طرح منزلوں سے ہوں محروم
میں شریکِ سفر نہ تھا جیسے

اب بھی ویسی ہے دوریٔ منزل
ساتھ چلتا ہو راستہ جیسے

اتفاقاً بھی زندگی میں فرازؔ
دوست ملتے نہیں ضیاؔ جیسے
(ضیاء سے مراد ضیاء الدین ضیاء)

تریاق

جب تری اداس انکھڑیوں میں
پل بھر کو چمک اٹھے تھے آنسو
کیا کیا نہ گزر گئی تھی دل پر
جب میرے لیے ملول تھی تُو

کہنے کو وہ زندگی کا لمحہ
پیمانِ وفا سے کم نہیں تھا
ماضی کی طویل تلخیوں کا
جیسے مجھے کوئی غم نہیں تھا
تُو، میرے لیے اداس اتنی
کیا تھا یہ اگر کرم نہیں تھا

تو آج بھی میرے سامنے ہے
آنکھوں میں اداسیاں نہ آنسو
اک طنز ہے تیری ہر ادا میں
چبھتی ہے ترے بدن کی خوشبو
یا اب مرے زخم بھر چکے ہیں
یا سب مرا زہر پی چکی تُو

مستقل محرومیوں پر بھی تو دل مانا نہیں
لاکھ سمجھایا کہ اُس محفل میں اب جانا نہیں

خود فریبی ہی سہی کیا کیجیے دل کا علاج
تو نظر پھیرے تو ہم سمجھیں کہ پہچانا نہیں

ایک دنیا منتظر ہے اور تیری بزم میں
اِس طرح بیٹھے ہیں ہم جیسے کہیں جانا نہیں

جی میں جو آتی ہے کر گزرو کہیں ایسا نہ ہو
کل پشیماں ہوں کہ کیوں دل کا کہا مانا نہیں

زندگی پر اِس سے بڑھ کر طنز کیا ہوگا فرازؔ
اُس کا یہ کہنا کہ تو شاعر ہے دیوانہ نہیں

تُو پاس بھی ہو تو دل بے قرار اپنا ہے
کہ ہم کو تیرا نہیں انتظار اپنا ہے

ملے کوئی بھی ترا ذکر چھیڑ دیتے ہیں
کہ جیسے سارا جہاں راز دار اپنا ہے

وہ دور ہو تو بجا ترکِ دوستی کا خیال
وہ سامنے ہو تو کب اختیار اپنا ہے

زمانے بھر کے دکھوں کو لگا لیا دل سے
اِس آسرے پہ کہ اک غمگسار اپنا ہے

بلا سے جاں کا زیاں ہو اِس اعتماد کی خیر
وفا کرے نہ کرے پھر بھی یار اپنا ہے

فراز راحتِ جاں بھی وہی ہے کیا کیجیے
وہ جس کے ہاتھ سے سینہ فگار اپنا ہے

جس سے یہ طبیعت بڑی مشکل سے لگی تھی
دیکھا تو وہ تصویر ہر اک دل سے لگی تھی

تنہائی میں روتے ہیں کہ یوں دل کو سکون ہو
یہ چوٹ کسی صاحبِ محفل سے لگی تھی

اے دل ترے آشوب نے پھر حشر جگایا
بے درد ابھی آنکھ بھی مشکل سے لگی تھی

خلقت کا عجب حال تھا اُس کوئے ستم میں
سائے کی طرح دامنِ قاتل سے لگی تھی

اترا بھی تو کب درد کا چڑھتا ہوا دریا
جب کشتیٔ جاں موت کے ساحل سے لگی تھی

کسی کے تذکرے بستی میں کو بکو جو ہوئے
ہمیں خموش تھے موضوعِ گفتگو جو ہوئے

نہ دل کا درد ہی کم ہے نہ آنکھ ہی نم ہے
نہ جانے کون سے ارمان تھے وہ لہو جو ہوئے

نظر اٹھائی تو گم گشتۂ تحیّر تھے
ہم آئینے کی طرح تیرے رُوبرو جو ہوئے

پیغام seekho aur sikhao

ہمیں ہیں وعدۂ فردا پہ ٹالنے والے
ہمیں نے بات بدل دی بہانہ خُو جو ہوئے

فرازؔ ہو کہ وہ فرہادؔ ہو کہ ہو منصورؔ
انہیں کا نام ہے ناکامِ آرزو جو ہوئے

مجھ سے پہلے

مجھ سے پہلے جس شخص نے تجھے چاہا اُس نے
شاید اب بھی ترا غم دل سے لگا رکھا ہو
ایک بے نام سی امید پہ اب بھی شاید
اپنے خوابوں کے جزیروں کو سجا رکھا ہو

میں نے مانا کہ وہ بیگانۂ پیمانِ وفا
کھو چکا ہے جو کسی اور کی رعنائی میں
شاید اب لوٹ کے آئے نہ تری محفل میں
اور کوئی دکھ نہ رلائے تجھے تنہائی میں

میں نے مانا کہ شب و روز کے ہنگاموں میں
وقت ہر غم کو بُھلا دیتا ہے رفتہ رفتہ
چاہے امید کی شمعیں ہوں کہ یادوں کے چراغ
مستقل بُعد بُجھا دیتا ہے رفتہ رفتہ

پھر بھی ماضی کا خیال آتا ہے گاہے گاہے
مدتیں درد کی لو کم تو نہیں کر سکتیں
زخم بھر جائیں مگر داغ تو رہ جاتے ہیں
دوریوں سے کبھی یادیں تو نہیں مر سکتیں

یہ بھی ممکن ہے کہ اک دن وہ پشیمان ہو کر
تیرے پاس آئے زمانے سے کنارا کر لے
تو کہ معصوم بھی ہے، زود فراموش بھی ہے
اُس کی پیماں شکنی کو بھی گوارا کر لے

اور میں، جس نے تجھے اپنا مسیحا سمجھا
ایک زخم اور بھی پہلے کی طرح سہہ جاؤں
جس پہ پہلے بھی کئی عہدِ وفا ٹوٹے ہیں
اِسی دوراہے پہ چپ چاپ کھڑا رہ جاؤں

کروں نہ یاد مگر کس طرح بھلاؤں اسے
غزل بہانہ کروں اور گنگناؤں اسے

وہ خار خار ہے شاخِ گلاب کی مانند
میں زخم زخم ہوں پھر بھی گلے لگاؤں اسے

یہ لوگ تذکرے کرتے ہیں اپنے لوگوں کے
میں کیسے بات کروں، اب کہاں سے لاؤں اسے

مگر وہ زود فراموش، زود رنج بھی ہے
کہ روٹھ جائے، اگر یاد کچھ دلاؤں اسے

وہی جو دولتِ دل ہے وہی جو راحتِ جاں
تمہاری بات پہ اے ناصحو، گنواؤں اسے

جو ہم سفر سرِ منزل بچھڑ رہا ہے فرازؔ
عجب نہیں ہے اگر یاد بھی نہ آؤں اسے

اب اور کیا کسی سے مراسم بڑھائیں ہم
یہ بھی بہت ہے تجھ کو اگر بھول جائیں ہم

صحرائے زندگی میں کوئی دوسرا نہ تھا
سنتے رہے ہیں آپ ہی اپنی صدائیں ہم

اس زندگی میں اتنی فراغت کسے نصیب
اتنا نہ یاد آ کہ تجھے بھول جائیں ہم

seekho aur sikhao

تو اتنی دل زدہ تو نہ تھی اے شبِ فراق
آ تیرے راستے میں ستارے لٹائیں ہم

وہ لوگ اب کہاں ہیں جو کہتے تھے کل فرازؔ
ہے ہے ، خدا نہ کرے تجھے بھی رلائیں ہم

اتری تھی شہرِ گل میں کوئی آتشیں کرن
وہ روشنی ہوئی کہ سلگنے لگے بدن

غارت گرِ چمن سے عقیدت تھی کس قدر
شاخوں نے خود اتار دیے اپنے پیرہن

اِس انتہائے قرب نے دھندلا دیا تجھے
کچھ دور ہو کہ دیکھ سکوں تیرا بانکپن

میں بھی تو کھو چلا تھا زمانے کے شور میں
یہ اتفاق ہے کہ وہ یاد آ گئے معاً

جس کے طفیل مہر بلب ہم رہے فرازؔ
اُس کے قصیدہ خواں ہیں سبھی اہلِ انجمن

پیغام seekho aur sikhao

کوئی بھٹکتا بادل

دور اک شہر سے جب کوئی بھٹکتا بادل
میری جلتی ہوئی بستی کی طرف آئے گا
کتنی حسرت سے اسے دیکھیں گی پیاسی آنکھیں
اور وہ وقت کی مانند گزر جائے گا

پیغام
seekho aur sikhao

جانے کس سوچ میں کھو جائے گی دل کی دنیا
جانے کیا کیا مجھے بیتا ہُوا یاد آئے گا
اور اُس شہر کا بے فیض بھٹکتا بادل
درد کی آگ کو پھیلا کے چلا جائے گا

کیسی طلب اور کیا اندازے، مشکل ہے تقدیر بنے
دل پر جس کا ہاتھ بھی رکھیو آخر وہ شمشیر بنے

غم کے رشتے بھی نازک تھے تم آئے اور ٹوٹ گئے
دل سا وحشی اب کیا سنبھلے اب کیا شے زنجیر بنے

اپنا لہو، تیری رعنائی تاریکی اِس دنیا کی
میں نے کیا کیا رنگ چُنے ہیں دیکھوں کیا تصویر بنے

اپنا یہ عالم ہے خود سے بھی اپنے زخم چھپاتے ہیں
لوگوں کو یہ فکر کہ کوئی موضوعِ تشہیر بنے

تم نے فرازؔ اس عشق میں سب کچھ کھو کر بھی کیا پایا ہے
وہ بھی تو ناکامِ وفا تھے جو غالبؔ اور میرؔ بنے

اپنی محبت کے افسانے کب تک راز بناؤ گے
رسوائی سے ڈرنے والو، بات تمہیں پھیلاؤ گے

اس کا کیا ہے تم نہ سہی، تو چاہنے والے اور بہت
ترکِ محبت کرنے والو، تم تنہا رہ جاؤ گے

ہجر کے ماروں کی خوش فہمی، جاگ رہے ہیں پہروں سے
جیسے یوں شب کٹ جائے گی جیسے تم آجاؤ گے

زخمِ تمنا کا بھر جانا گویا جان سے جانا ہے
اُس کا بُھلانا سہل نہیں ہے خود کو بھی یاد آؤ گے

چھوڑو عہدِ وفا کی باتیں کیوں جھوٹے اقرار کریں
کل میں بھی شرمندہ ہوں گا کل تم بھی پچھتاؤ گے

رہنے دو یہ پند و نصیحت ہم بھی فرازؔ سے واقف ہیں
جس نے خود سو زخم سہے ہوں اُس کو کیا سمجھاؤ گے

زندگی! اے زندگی

میں بھی چپ ہو جاؤں گا بجھتی ہوئی شمعوں کے ساتھ
اور کچھ لمحے ٹھہر! اے زندگی! اے زندگی!
جب تلک روشن ہیں آنکھوں کے فسردہ طاقچے
نیلگوں ہونٹوں سے پھوٹے گی صدا کی روشنی
جسم کی گرتی ہوئی دیوار کو تھامے ہوئے
موم کے بُت آتشیں چہرے سُلگتی مُورتیں
میری بینائی کی یہ مخلوق زندہ ہے ابھی
اور کچھ لمحے ٹھہر! اے زندگی! اے زندگی!

ہو تو جانے دے مرے لفظوں کو معنی سے تہی
میری تحریریں، دھوئیں کی رینگتی پرچھائیاں
جن کے پیکر اپنی آوازوں سے خالی ہے لہو
محو ہو جانے تو دے یادوں سے خوابوں کی طرح
رک جائیں تو آخری سانسوں کی وحشی آندھیاں
پھر ہٹا لینا مرے ماتھے سے تو بھی اپنا ہاتھ
میں بھی چپ ہو جاؤں گا بجھتی ہوئی شمعوں کے ساتھ
اور کچھ لمحے ٹھہر! اے زندگی! اے زندگی!

پیغام seekho aur sikhao

چند لمحوں کے لیے تُو نے مسیحائی کی
پھر وہی میں ہوں وہی عمر ہے تنہائی کی

کس پہ گزری نہ شبِ ہجر، قیامت کی طرح
فرق صرف اتنا ہے کہ ہم نے سخن آرائی کی

اپنی بانہوں میں سمٹ آئی ہے وہ قوسِ قزح
لوگ تصویر ہی کھینچا کیے انگڑائی کی

پیغام seekho aur sikhao

غیرتِ عشق بجا، طعنۂ یاراں تسلیم
بات کرتے ہیں مگر سب اُسی ہرجائی کی

اُن کو بھولے ہیں تو کچھ اور پریشاں ہیں فرازؔ
اپنی دانست میں دل نے بڑی دانائی کی

زعم ایسا کیا کہ لطفِ دوست ٹھکرانا پڑے
یہ طبیعت ہے تو شاید جاں سے بھی جانا پڑے

خانہ ویرانی تو ہوتی ہے مگر ایسی کہاں
اپنی آنکھوں سے خود اپنا گھر نہ جلانا پڑے

رسم چل نکلی عجب اب مے کدے کی خیر ہو
ہے وہی جمشید جس کے ہاتھ پیمانہ پڑے

سوچ لو اُس بزم سے اٹھنے سے پہلے سوچ لو
یہ نہ ہو پھر دل کے ہاتھوں لوٹ کر آنا پڑے

لے چلے ہیں حضرتِ ناصح مجھے جس راہ سے
لطف آئے جب اُدھر بھی کوئے جانا نہ پڑے

غم ہی ایسا تھا کہ دل شَق ہو گیا ورنہ فرازؔ
کیسے کیسے حادثے ہنس ہنس کے سہہ جانا پڑے

اب فرصت ہے نہ احساس ہے غم سے اپنے
ورنہ ہم روز ہی ملتے تھے صنم سے اپنے

دل نہ مانا کہ کسی اور کے راستے پہ چلیں
لاکھ گمراہ ہوئے نقشِ قدم سے اپنے

جی چکے ہم جو یہی شوق کی رسوائی ہے
تم سے بیگانے ہوئے جاتے ہیں ہم سے اپنے

ہم نہیں پھر بھی تو آباد ہے محفل اُن کی
ہم سمجھتے تھے کہ رونق ہے تو دم سے اپنے

میرے دامن کے مقدر میں ہے خالی رہنا
آپ شرمندہ نہ ہوں دستِ کرم سے اپنے

رہ چکے مرگِ تمنا پہ بھی اک عمر فرازؔ
اب جو زندہ ہیں تو شعروں کے بھرم سے اپنے

یہ توجب ممکن ہے۔۔۔

پھر چلے آئے ہیں ہمدم لے کے ہمدردی کے نام
آہوئے رَم خوردہ کی وحشت بڑھانے کے لیے
میرے دل سے تیری چاہت کو مٹانے کے لیے

چھیڑ کر افسانۂ ناکامیٔ اہلِ وفا
تیری مجبوری کے قصے میری بربادی کی بات
اپنی اپنی سرگزشتیں دوسروں کے تجربات

اُن کو کیا معلوم لیکن تیری چاہت کے کرم
میری تنہائی کے دوزخ میری جنت کے بھرم
تیری آنکھوں کا وفا آمیز افسردہ خیال

کاش اتنا سوچ سکتے غم گساروں کے دماغ
یہ توجب ممکن ہے جب بجھ جائے ہر آنسو ہر چراغ
خود کو اِن میں دفن کردوں بھول جاؤں اپنا نام

تم بھی خفا ہو لوگ بھی برہم ہیں دوستو
اب ہو چلا یقیں کہ بُرے ہم ہیں دوستو

کس کو ہمارے حال سے نسبت ہے، کیا کہیں
آنکھیں تو دشمنوں کی بھی پُرنم ہیں دوستو

اپنے سوا ہمارے نہ ہونے کا غم کسے
اپنی تلاش میں تو ہمیں ہم ہیں دوستو

کچھ آج شام ہی سے ہے دل بھی بجھا بجھا
کچھ شہر کے چراغ بھی مدھم ہیں دوستو

اِس شہرِ آرزو سے بھی باہر نکل چلو
اب دل کی رونقیں بھی کوئی دم ہیں دوستو

سب کچھ سہی فرازؔ پر اتنا ضرور ہے
دنیا میں ایسے لوگ بہت کم ہیں دوستو

تو کہاں تھا زندگی کے روز و شب آنکھوں میں تھے
آج یاد آیا کہ آنسو بے سبب آنکھوں میں تھے

رات بھر تاروں کی صورت جاگتے رہنا ہمیں
صبحدم کہنا کہ کیا کیا خوابِ شب آنکھوں میں تھے

تیری یادوں کی مہک ہر درد کو بسرا گئی
ورنہ ترے دکھ بھی اے شہرِ طرب آنکھوں میں تھے

اب تلک جن کی جدائی کا قلق جی کو نہ تھا
آج تُو بچھڑا تو وہ بھی سب کے سب آنکھوں میں تھے

اب تو ضبطِ غم نے پتھر کر دیا ورنہ فرازؔ
دیکھتا کوئی کہ دل کے زخم جب آنکھوں میں تھے

لمحے وفورِ شوق کے ایسے نہ آئے تھے
یوں چپ ہیں ترے پاس ہی جیسے نہ آئے تھے

ساقی شکستِ جام سے چہروں پہ دیکھنا
وہ رنگ بھی کہ شعلۂ مے سے نہ آئے تھے

دل پر لگی خراش تو چہرے شفق ہوئے
اب تک تو زخم راس کچھ ایسے نہ آئے تھے

پہلے بھی روئے ہیں مگر اب کے وہ کرب ہے
آنسو کبھی بھی آنکھوں میں جیسے نہ آئے تھے

جب صبح ہو چکی ہے تو کیا سوچنا فرازؔ
وہ رات کیوں نہ آئے تھے کیسے نہ آئے تھے

پیغام seekho aur sikhao

شہدائے جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے نام

تم نے جس دن کے لیے اپنے جگر چاک کیے
سو برس بعد سہی دن تو وہ آیا آخر
تم نے جس دشتِ تمنا کو لہو سے سینچا
ہم نے اُس کو گل و گلزار بنایا آخر
نسل در نسل رہی جہدِ مسلسل کی تڑپ
ایک اک بُوند نے طوفان اٹھایا آخر
تم نے اک ضرب لگائی تھی حصارِ شب پر
ہم نے ہر ظلم کی دیوار کو ڈھایا آخر

وقت تاریک خرابوں کا وہ عفریت ہے جو
ہر گھڑی تازہ چراغوں کا لہو پیتا ہے
زلفِ آزادی کے ہر تار سے دستِ ایّام
حریت کیش جوانوں کے کفن لیتا ہے
تم سے جس دورِ المناک کا آغاز ہُوا

ہم پہ وہ عہدِ ستم ایک صدی بیتا ہے
تم نے جو جنگ لڑی ننگِ وطن کی خاطر
مانا اس جنگ میں تم ہارے عدو جیتا ہے

لیکن اے جذبِ مقدس کے شہیدانِ عظیم
کل کی ہار اپنے لیے جیت کی تمہید بنی
ہم صلیبوں پہ چڑھے زندہ گڑے پھر بھی بڑھے
وادیٔ مرگ بھی منزل گہِ امید بنی
ہاتھ کٹتے رہے پر مشعلیں تابندہ رہیں
رسم جو تم سے چلی باعثِ تقلید بنی
شب کے سفّاک خداؤں کو خبر ہو کہ نہ ہو
جو کرن قتل ہوئی شعلۂ خورشید بنی

پیغام seekho aur sikhao

پیمبرِ مشرق

وہ شب کہ جس میں ترا شعلۂ نوا لپکا
ڈھلی تو ماتمِ یک شہرِ آرزو بھی ہُوا
وہ رُت کہ جس میں ترا نغمۂ جنوں گونجا
کئی تو سازِ تمنا لہُو لہُو بھی ہوا

پیغام
seekho aur sikhao

یہی بہت تھا کوئی منزلِ طلب تو ملی
کہیں تو مژدۂ قربِ حریمِ یار ملا
ہزار شکر کہ طعنِ برہنگی تو گیا
اگرچہ پیرہنِ شوق تار تار ملا

خیال تھا کہ شکستِ قفس کے بعد بھی ہم
ترے پیام کے روشن چراغ دیکھیں گے
رہے گا پیشِ نظر تیرا آئینہ جس میں
ہم اپنے ماضی و فردا کے داغ دیکھیں گے

مگر جو حال طلوعِ سحر کے بعد ہُوا
جو تیرے درس کی تحقیر ہم نے دیکھی ہے
بیاں کریں بھی تو کس، کہیں تو کس سے کہیں
جو تیرے خواب کی تعبیر ہم نے دیکھی ہے

مدبروں نے وفا کے چراغ گُل کر کے
دراز دستیٔ جاہ و چشم کو عام کیا
مفکروں نے فقیہوں کی دل دہی کے لیے
خودی کی مے میں تصوف کا زہر گھول دیا

وہ کم نظر تھے کہ نادان تھے کہ شعبدہ گر
جو تجھ کو جن و ملائک کا ترجماں سمجھے
تری نظر میں ہمیشہ زمیں کے زخم رہے
مگر یہ تجھ کو مسیحائے آسماں سمجھے

عروجِ عظمتِ آدم تھا مدّعا تیرا
مگر یہ لوگ نقوشِ فنا اُبھارتے ہیں
کس آسماں پہ ہے تُو اے پیمبرِ مشرق
زمیں کے زخم آج بھی تجھے پکارتے ہیں

پیغام seekho aur sikhao

اسی خیال میں تاروں کو رات بھر دیکھوں
کہ تجھ کو صبحِ قیامت سے پیشتر دیکھوں

اِس اک چراغ کی لَو چبھ رہی ہے آنکھوں میں
تمام شہر ہو روشن تو اپنا گھر دیکھوں
مجھے خود اپنی طبیعت پہ اعتماد نہیں
خدا کرے کہ تجھے اب نہ عمر بھر دیکھوں

صدائے غولِ بیاباں نہ ہو یہ آوازہ
مرا وجود ہے پتّھر جو لوٹ کر دیکھوں

نظر عذاب ہے اب پاؤں میں ہو اگر زنجیر
فضا کے رنگ کو دیکھوں کہ بال و پر دیکھوں

جدا سہی مری منزل بچھڑ نہیں سکتا
میں کس طرح تجھے اوروں کا ہمسفر دیکھوں

وہ لب فرازؔ اگر کر سکیں مسیحائی
بقولِ درد میں سو سو طرح سے مر دیکھوں

(بطرزِ بیدل)

جنبشِ مژگاں کہ ہر دم دل کشائے زخم ہے
جو نظر اٹھتی ہے گویا آشنائے زخم ہے

دیکھنا آئینِ مقتل، دلفگارانِ وفا
التفاتِ تیغِ قاتل خوں بہائے زخم ہے

بسکہ جوششِ فصلِ گل سے کھل گئے سینوں کے چاک
خندۂ گل بھی ہم آہنگِ صدائے زخم ہے

ہم نفس، ہر آستیں میں دشنہ پنہاں ہے تو کیا
ہم کو پاسِ خاطرِ یاراں بجائے زخم ہے

آتماشا کر کبھی اے بے نیازِ شامِ غم
دیدۂ بے خواب بھی چاکِ قبائے زخم ہے

کس سے جز دیوارِ مژگاں، سیلِ دردِ دل رُکے
ساحلِ دریائے خوں لب آشنائے زخم ہے

ضبطِ گریہ، چشمِ خوں بستہ کو تھا عقدہ کشا
رہ گیا تھا دل میں جو آنسو بنائے زخم ہے

شعلۂ افسردگی ہے شمعِ فانوسِ خیال
داغ کیا ہے دل سے پیمانِ وفائے زخم ہے

اب تو دامن تک پہنچ آیا سرِ چاکِ جنوں
ہم تو سمجھے تھے کہ بس دل انتہائے زخم ہے

سلسلہ ہائے طلب سے رُستگاری ہے کسے
دل ہلاکِ ناوک و ناوک فدائے زخم ہے

چارہ گر نے بہرِ تسکیں رکھ دیا ہے دل پہ ہاتھ
مہرباں ہے وہ مگر نا آشنائے زخم ہے

میری وحشت کب ہوئی رسوائے عریانی فرازؔ
کل بدن پر پیرہن تھا اب ردائے زخم ہے

المیہ

کس تمنا سے یہ چاہا تھا کہ اک روز تجھے
ساتھ اپنے لیے اس شہر کو جاؤں گا جسے
مجھ کو چھوڑے ہوئے بھولے ہوئے اک عمر ہوئی

ہائے وہ شہر کہ جو میرا وطن ہے پھر بھی
اُس کی مانوس فضاؤں سے رہا بیگانہ
میرا دل میرے خیالوں کی طرح دیوانہ

آج حالات کا یہ طنز جگر سوز تو دیکھ
تو مرے شہر کے اک حجلۂ زریں میں مکیں
اور میں پردیس میں جاں دادۂ یک نانِ جویں

ملکیت

سسکیاں لینے سے کیا فائدہ اے زینتِ شب
دیکھ اس ہنستی ہوئی رات کو افسردہ نہ کر
تیرا رونا تجھے تسکین تو دے سکتا ہے
لیکن اس انجمنِ عیش کو آزردہ نہ کر

مجھ پر روشن ہے ترے سوئے ہوئے درد کی آگ
جبر کی بادہ گساری سے بھڑک اٹھی ہے
تیری کچلی ہوئی غیرت تری روندی ہوئی روح
اک حقارت بھری ٹھوکر سے پھڑک اٹھی ہے

اور یہ توہین ترے جسم کی توہین نہ تھی
ورنہ یہ زہر تو ہنس ہنس کے پیا ہے تُو نے
وقفِ گردش رہی ساغر کی طرح دست بدست
بزم کی بزم کو سرشار کیا ہے تُو نے

تُو نے ہر جلتی ہوئی روح کو گلزار کیا
تُو ہر اک ہاتھ میں غنچے کی طرح چٹکی ہے
تُو نے ہر دوش پہ بکھرائی ہیں اپنی زلفیں
تُو ہر آغوش میں خوشبو کی طرح بھٹکی ہے

مگر امشب ترے احساس پہ وہ چوٹ پڑی
تلخ فاقوں کی اذیت بھی بھلا دی جس نے
تیرے کردار کے صحرا سے وہ آندھی اٹھی
فکر فردا کی بھی دیوار گرا دی جس نے

تجھ کو معلوم نہیں ہے مگر اے دشمنِ جاں
اس تجارت سے عبارت تری شخصیت ہے
جسم سے لیکر تری روح تلک آج کی رات
یا مری یا مرے احباب کی ملکیت ہے

منتظر کب سے تحیّر ہے تری تقریر کا
بات کر، تجھ پر گماں ہونے لگا تصویر کا

رات کیا سوئے کہ باقی عمر کی نیند اڑ گئی
خواب کیا دیکھا کہ دھڑکا لگ گیا تعبیر کا
کیسے پایا تھا تجھے، پھر کس طرح کھویا تجھے
مجھ سا منکر بھی تو قائل ہو گیا تقدیر کا

جس طرح بادل کا سایہ پیاس بھڑکاتا رہے
میں نے یہ عالم بھی دیکھا ہے تری تصویر کا

جانے کس عالم میں تو بچھڑا کہ ہے ترے بغیر
آج تک ہر نقش فریادی مری تحریر کا
عشق میں سر پھوڑنا بھی کیا کہ یہ بے مہر لوگ
جوئے خوں کو نام دے دیتے ہیں جوئے شِیر کا

جس کو بھی چاہا اُسے شدت سے چاہا ہے فرازؔ
سلسلہ ٹوٹا نہیں ہے درد کی زنجیر کا

اہلِ غم جاتے ہیں ناامید تیرے شہر سے
جب نہیں تجھ سے تو کیا امید تیرے شہر سے

دیدنی تھی سادگی ان کی جو رکھتے تھے کبھی
اے وفا نا آشنا امید تیرے شہر سے

تیرے دیوانوں کے حق میں زہرِ قاتل ہو گئی
ناامیدی سے سوا امید تیرے شہر سے

پابجولاں دل گرفتہ پھر رہے ہیں کُو بکو
ہم جو رکھتے تھے سوا امید تیرے شہر سے

تُو تو بے پرواہی تھا اب لوگ بھی پتھر ہوئے
یا ہمیں تجھ سے تھی یا امید تیرے شہر سے

راستے کیا کیا چمک جاتے ہیں اے جانِ فرازؔ
جب بھی ہوتی ہے ذرا امید تیرے شہر سے

تمثیل

کتنی صدیوں کے انتظار کے بعد
قربتِ یک نفس نصیب ہوئی
پھر بھی تو چُپ، اداس، کم آمیز

اے سلگتے ہوئے چراغ بھڑک
درد کی روشنی کو چاند بنا
کہ ابھی آندھیوں کا شور ہے تیز

ایک پل مرگِ جاوداں کا صلہ
اجنبیت کے زہر میں مت گھول
مجھ کو مت دیکھ لیکن آنکھ تو کھول

پیغام seekho aur sikhao

آنکھوں میں چبھ رہے ہیں در و بام کے چراغ
جب دل ہی بجھ گیا ہو تو کس کام کے چراغ

کیا شام تھی کہ جب ترے آنے کی آس تھی
اب تک جلا رہے ہیں ترے نام کے چراغ

شاید کبھی یہ عرصۂ یک شب نہ کٹ سکے
تو صبح کی ہوا ہے تو ہم شام کے چراغ

اِس تیرگی میں لغزشِ پا بھی ہے خودکشی
اے رہ نوردِ شوق ذرا تھام کے چراغ

ہم کیا بجھے کہ جاتی رہی یادِ رفتگاں
شاید ہمیں تھے گردشِ ایّام کے چراغ

ہم درخورِ ہوائے ستم بھی نہیں فرازؔ
جیسے مزار پر کسی گمنام کے چراغ

نظر کی دھوپ میں سائے گھلے ہیں شب کی طرح
میں کب اداس نہیں تھا مگر نہ اب کی طرح

پھر آج شہرِ تمنا کی رہگزاروں سے
گزر رہے ہیں کئی لوگ روز و شب کی طرح

تجھے تو میں نے بڑی آرزو سے چاہا تھا
یہ کیا کہ چھوڑ چلا تو بھی اور سب کی طرح

پیغام seekho aur sikhao

فسردگی ہے مگر وجہِ غم نہیں معلوم
کہ دل پہ بھی بوجھ سا ہے رنجِ بے سبب کی طرح

کِھلے تو اب کے بھی گلشن میں پھول ہیں لیکن
نہ میرے زخم کی صورت، نہ تیرے لب کی طرح

ہم کیا کہ اسی سوچ میں بادِ چمنی تھی
وہ گل کی چٹک تھی کہ تری کم سخنی تھی

آنسو کی وہ اک بوند جو آنکھوں سے نہ ٹپکی
آئینہ دل کے لیے ہیرے کی کنی تھی

پیمانے کو ہم منہ سے لگاتے نہ لگاتے
ساقی کی ملاقات ہی توبہ شکنی تھی

اب صورتِ دیوار ہیں چپ چاپ کہ تجھ سے
کچھ اور تعلق نہ سہی ہم سخنی تھی

یہ جاں جو کڑی دھوپ میں جلتی رہی برسوں
اوروں کے لیے سایۂ دیوار بنی تھی

دنیا سے بچھڑتے کہ فرازؔ اُن کو بھلاتے
ہر حال میں اپنے لیے پیماں شکنی تھی

نیند

سرد پلکوں کی صلیبوں سے اتارے ہوئے خواب
ریزہ ریزہ ہیں مرے سامنے شیشوں کی طرح
جن ٹکڑوں کی چبھن، جن کی خراشوں کی جلن
عمر بھر جاگتے رہنے کی سزا دیتی ہے
شدتِ کرب سے دیوانہ بنا دیتی ہے

پیغام
seekho aur sikhao

آج اِس قرب کے ہنگام وہ احساس کہاں
دل میں وہ درد نہ آنکھوں میں چراغوں کا دھواں
اور صلیبوں سے اتارے ہوئے خوابوں کی مثال
جسم گرتی ہوئی دیوار کی مانند نڈھال
تو مرے پاس سہی اے مرے آزردہ جمال

خوشبو کا سفر

چھوڑ پیمانِ وفا کی بات شرمندہ نہ کر
دوریاں، مجبوریاں، رسوائیاں، تنہائیاں
کوئی قاتل، کوئی بسمل، سسکیاں، شہنائیاں
دیکھ یہ ہنستا ہوا موسم ہے موضوعِ نظر

وقت کی رَو میں ابھی ساحل ابھی موجِ فنا
ایک جھونکا، ایک آندھی، اک کرن، اک جوئے خوں
پھر وہی صحرا کا سناٹا وہی مرگِ جنوں
ہاتھ ہاتھوں کا اثاثہ، ہاتھ ہاتھوں سے جدا
جب کبھی آئے گا ہم پر بھی جدائی کا سماں

ٹوٹ جائے گا مرے دل میں کسی خواہش کا تیر
بھیگ جائے گی تری آنکھوں میں کاجل کی لکیر

کل کے اندیشوں سے اپنے دل کو آزردہ نہ کر
دیکھ یہ ہنستا ہوا موسم یہ خوشبو کا سفر

اب کے برس بھی

لب و تشنہ و نومید ہیں ہم اب کے برس بھی
اے ٹھہرے ہوئے ابرِ کرم اب کے برس بھی

کچھ بھی ہو گلستاں میں مگر کنجِ چمن سے
ہیں دور بہاروں کے قدم اب کے برس بھی

اے شیخِ کرم، دیکھ کہ باوصفِ چراغاں
تیرہ ہیں در و بامِ حرم اب کے برس بھی

اے دل زدگاں، خیر مناؤ کہ ہیں نازاں
پندارِ خدائی پہ صنم، اب کے برس بھی

پہلے بھی قیامت تھی ستم کاریٔ ایّام
ہیں کشتۂ غم، کشتۂ غم اب کے برس بھی

لہرائیں گے ہونٹوں پہ دکھاوے کے تبسم
ہو گا یہ نظارہ کوئی دم اب کے برس بھی

ہو جائے گا ہر زخمِ کہن پھر سے نمایاں
روئے گا لہو دیدۂ نم اب کے برس بھی

پہلے کی طرح ہوں گے تہی جامِ سفالیں
چھلکے گا ہر اک ساغرِ جم اب کے برس بھی

مقتل میں نظر آئیں گے پابستۂ زنجیر
اہلِ نظر و اہلِ قلم، اب کے برس بھی

پیغام seekho aur sikhao

تجھ سے مل کر بھی کچھ خفا ہیں ہم
بے مروّت نہیں تو کیا ہیں ہم

ہم غمِ کارواں میں بیٹھے تھے
لوگ سمجھے شکستہ پا ہیں ہم

اس طرح سے ہمیں رقیب ملے
جیسے مدت کے آشنا ہیں ہم

راکھ ہیں ہم اگر یہ آگ بجھی
جز غمِ دوست اور کیا ہیں ہم

خود کو سنتے ہیں اس طرح جیسے
وقت کی آخری صدا ہیں ہم

کیوں زمانے کو دیں فرازؔ الزام
وہ نہیں ہیں تو بے وفا ہیں ہم

تجھے اداس کیا خود بھی سوگوار ہوئے
ہم آپ اپنی محبت سے شرمسار ہوئے

بلا کی رَو تھی، ندیمانِ آبلہ پا کو
پلٹ کے دیکھنا چاہا کہ خود غبار ہوئے

گلہ اُسی کا کیا جس سے تجھ پہ حرف آیا
وگرنہ یوں تو ستم ہم پہ بے شمار ہوئے

پیغام seekho aur sikhao

یہ انتقام بھی لینا تھا زندگی کو ابھی
جو لوگ دشمنِ جاں تھے وہ غمگسار ہوئے

ہزار بار کیا ترکِ دوستی کا خیال
مگر فراز پشیمان ہر اک بار ہوئے

اَن دیکھے دیاروں کے سفیر

اور جب ہو گا ترازو ہجر کے ترکش کا تیر
مختلف ہوں گے تو کتنے دوسرے لوگوں سے ہم
جو چلے تھے کوچۂ جاناں سے مقتل کی طرف
بے نیازِ سنگِ خلقت، بے غمِ تیغِ ستم
اپنے اپنے شوقِ بے پرواہ کی باراتیں لیے
دردِ وارفتہ کی شمعوں کو جلائے ہر قدم
اُن میں ہر اک باوفا، ثابت قدم، زندہ ضمیر

اُن کی آنکھیں ریزہ ریزہ اُن کی جانیں زخم زخم
اُن کے آنسو کانچ کے تابوت ریشم کے کفن
اُن میں خوابیدہ کسی لیلا کسی شیریں کا خواب
اُن میں آسودہ جنونِ قیس و خونِ کوہکن
اُن کے ماتھوں پر شکستوں کے نشاں ضربِ عدو
اُن کے ہاتھوں کی لکیروں میں جوانمرگوں کا فن
اُن میں ہر اک تھا کسی دامِ تمنّا کا اسیر

اُن پہ جو گزری وہ گزرے گی ہر اہلِ درد پر
اور ہم دووں بھی اپنے جرم سے غافل نہیں
تری پیشانی کی سج دھج، میری چاہت کا غرور
گویا وہ زندہ ہیں جو شرمندۂ قاتل نہیں
پھر بھی کس دامن دریدہ کو یہاں بخشش ملی
اس سفر میں راستوں کے زخم ہیں منزل نہیں
اور ہم دونوں ہیں اَن دیکھے دیاروں کے سفیر

پیغام seekho aur sikhao

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں

ڈھونڈ اُجڑے ہوئے لوگوں میں وفا کے موتی
یہ خزانے تجھے ممکن ہے خرابوں میں ملیں

غمِ دنیا بھی غمِ یار میں شامل کر لو
نشہ بڑھتا ہے شرابیں جو شرابوں میں ملیں

تُو خدا ہے نہ مرا عشق فرشتوں جیسا
دونوں انساں ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں

آج ہم دار پہ کھینچے گئے جن باتوں پر
کیا عجب کل وہ زمانے کو نصابوں میں ملیں

اب نہ وہ میں، نہ وہ تُو ہے، نہ وہ ماضی ہے فرازؔ
جیسے دو شخص تمنّا کے سرابوں میں ملیں

اچھا تھا اگر زخم نہ بھرتے کوئی دن اور
اُس کوئے ملامت میں گزرتے کوئی دن اور

راتوں کو تری یادوں کے خورشید اُبھرتے
آنکھوں میں ستارے سے اترتے کوئی دن اور

ہم نے تجھے دیکھا تو کسی کو بھی نہ دیکھا
اے کاش ترے بعد گزرتے کوئی دن اور

راحت تھی بہت رنج میں ہم غم طلبوں کو
تم اور بگڑتے تو سنورتے کوئی دن اور

گو ترکِ تعلق تھا مگر جاں پہ بنی تھی
مرتے جو تجھے یاد نہ کرتے کوئی دن اور

اس شہرِ تمنا سے فرازؔ آئے ہی کیوں تھے
یہ حال اگر تھا تو ٹھہرتے کوئی دن اور

ترس رہا ہوں مگر تو نظر نہ آ مجھ کو
کہ خود جدا ہے تو مجھ سے نہ کر جدا مجھ کو

وہ کپکپاتے ہوئے ہونٹ میرے شانے پر
وہ خواب سانپ کی مانند ڈس گیا مجھ کو
چٹخ اٹھا ہوں سلگتی چٹان کی صورت
پکار اب تو مرے دیر آشنا مجھ کو

تجھے تراش کے میں سخت منفعل ہوں کہ لوگ
تجھے صنم، تو سمجھنے لگے خدا مجھ کو

seekho aur sikhao

یہ قربتیں ہی تو وجہِ فراق ٹھہری ہیں
بہت عزیز ہیں یارانِ بے وفا مجھ کو

ستم تو یہ ہے کہ ظالم سخن شناس نہیں
وہ ایک شخص کہ شاعر بنا گیا مجھ کو

اُسے فرازؔ اگر دکھ نہ تھا بچھڑنے کا
تو کیوں وہ دور تلک دیکھتا رہا مجھ کو

کسی طرح تو بیاں حرفِ آرزو کرتے
جو لب سِلے تھے تو آنکھوں سے گفتگو کرتے

بس اک نعرۂ مستاں دریدہ پیرہنو
کہاں کے طوق و سلاسل بس ایک ہُو کرتے

کبھی تو ہم سے بھی اے ساکنانِ شہرِ خیال
تھکے تھکے ہوئے لہجے میں گفتگو کرتے

گُلوں سے جسم تھے شاخِ صلیب پر لرزاں
تو کس نظر سے تماشائے رنگ و بُو کرتے

بہت دنوں سے ہے بے آب چشمِ خوں بستہ
وگرنہ ہم بھی چراغاں کنارِ جُو کرتے

یہ قربِ مرگِ وفا ہے اگر خبر ہوتی
تو ہم بھی تجھ سے بچھڑنے کی آرزو کرتے

چمن پرست نہ ہوتے تو اے نسیمِ بہار
مثالِ برگِ خزاں تیری جستجو کرتے

ہزار کوس پہ تُو اور یہ شامِ غربت کی
عجیب حال تھا پر کس سے گفتگو کرتے

فرازؔ مصرعۂ آتشؔ پہ کیا غزل کہتے
زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے

پیغام
seekho aur sikhao

میں اور تُو

روز جب دھوپ پہاڑوں سے اترنے لگتی
کوئی گھٹتا ہوا بڑھتا ہوا بے کل سایہ
ایک دیوار سے کہتا کہ مرے ساتھ چلو

اور زنجیرِ رفاقت سے گریزاں دیوار
اپنے پندار کے نشے میں سدا اِستادہ
خواہشِ ہمدمِ دیرینہ پہ ہنس دیتی تھی

کون دیوار کسی سائے کے ہمراہ چلی
کون دیوار ہمیشہ مگر اِستادہ رہی
وقت دیوار کا ساتھی ہے نہ سائے کا رفیق

اور اب سنگ و خشت کے ملبے کے تلے
اُسی دیوار کا پندار ہے ریزہ ریزہ
دھوپ نکلی ہے مگر جانے کہاں ہے سایہ

پیغام seekho aur sikhao

کون آتا ہے مگر آس لگائے رکھنا
عمر بھر درد کی شمعوں کو جلائے رکھنا

دوست پرسش پہ مصر اور ہمارا شیوہ
اپنے احوال کو خود سے بھی چھپائے رکھنا

ہم کو اُس نام نے مارا کہ جہاں بھی جائیں
خلقتِ شہر نے طوفان اٹھائے رکھنا

اِس چکا چوند میں آنکھیں بھی گنوا بیٹھو گے
اُس کے ہوتے ہوئے پلکوں کو جھکائے رکھنا

پیغام seekho aur sikhao

افریشیائی ادیبوں کے نام

جہانِ لوح و قلم کے مسافرانِ جلیل
ہم اہلِ دشتِ پشاور سلام کہتے ہیں
دلوں کا قرب کہیں فاصلوں سے مٹتا ہے
یہ حرفِ شوق بصد احترام کہتے ہیں
ہزار لفظ و بیاں و زباں کا فرق سہی
مگر حدیثِ وفا ہم تمام کہتے ہیں

وہ ماؤ ہو کہ لومبا، سکارنو ہو کہ فیض
سبھی کے لوح و قلم عظمتِ بشر کے نقیب
سب ایک درد کے رشتے میں منسلک بسمل
سبھی ہیں دور نظر سے سبھی دلوں کے قریب
جکارتہ و سرانديپ سے پشاور تک
سبھی کا ایک ہی نعرہ سبھی کی ایک صلیب

ہمیں یہ سوچنا ہوگا کہ زندگی اپنی
فضائے دہر میں کیوں موت سے بھی سستی ہے
ہم اہلِ شرق ہیں سورج تراشنے والے
مگر ہماری زمین نور کو ترستی ہے
یہ کیا کہ جو بھی گھٹا دشت سے ہمارے اٹھے
وہ دور پار سمندر پہ جا برستی ہے

پیغام seekho aur sikhao

فلک سے اب نہیں اترے گا کوئی پیغمبر
جہانِ آدم و حوا سنوارنے کے لیے
یہاں محمد (ﷺ) و گوتم، مسیح و کنفیوشس
جلا چکے ہیں بہت آگہی فروز دیے
مگر ہے آج بھی اپنا نصیب تاریکی
مگر ہے آج بھی مشرقِ شبِ دراز لیے

ہمیں کو توڑنے ہوں گے صنم قدامت کے
ہمیں کو اب نیا انسان ڈھالنا ہو گا
ہمیں کو اپنے قلم کی ستارہ سازی سے
ہر ایک خطہ تیرہ اُجالنا ہو گا
ہمیں کو امن کے گیتوں سے میٹھے بولوں سے
مہیب جنگ کی آندھی کو ٹالنا ہو گا

پیغام seekho aur sikhao

میں کہ پر شور سمندر تھے مرے پاؤں میں
اب کہ ڈوبا ہوں تو سوکھے ہوئے دریاؤں میں

نامرادی کا یہ عالم ہے کہ اب یاد نہیں
تُو بھی شامل تھا کبھی میری تمناؤں میں

دن کے ڈھلتے ہی اجڑ جاتی ہیں آنکھیں ایسے
جس طرح شام کو بازار کسی گاؤں میں

چاکِ دل سی کہ نہ سی، زخم کی توہین نہ کر
ایسے قاتل تو نہ تھے میرے مسیحاؤں میں

ذکر اس غیرتِ مریم کا جب آتا ہے فراز
گھنٹیاں بجتی ہیں لفظوں کے کلیساؤں میں

(ختم شدہ)